گردشِ دوراں

افسانے / افسانچے

حسن ساہو



میزان پبلشرز سرینگر کشمیر

گردشِ دوراں

افسانے/افسانچے

مصنف

حسن ساہو

رابطہ: الحسنات ، ہمدانیہ کالونی، بمنہ۔
سرینگر 190018 کشمیر
فون: 0194-2491910
موبائیل:09906439491

ناشر

میزان پبلیشرز (رجسٹرڈ)

بالمقابل فائر اینڈ ایمرجنسی سروسز ہیڈ کوارٹرس بمنہ مالو، سرینگر کشمیر

نام کتاب: گردش دوراں

نام مصنف: غلام حسن بٹ

تخلص: حسن ساہو

ناشر: میزان پبلشیرز، سرینگر کشمیر

کمپوزنگ: نثار شاہ

سال اشاعت: 2009ء

تعداد: ۵۰۰

سرورق: آفتاب

مطبوعہ: میزان سروسز

قیمت: تین سو پچاس روپے

زیر اہتمام: شبیر احمد

Author : Hassan Sahu
Hamdania Colony, Bemina
Srinagar 190018- Kashmir
Cell No.09906439491
Phone: 0194-2491910

Publisher: Meezan Publications
Opp. Fire and Emergency Services
Head Quarters Batmaloo
Srinagar-190009
FAX- 0194-2457215
Mob:09419002212
E.mail. Meezanpublishiers@rediffmail.com

کُل نفس ذایقۃ الموت



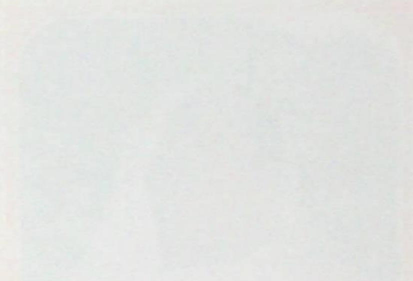
افسانوی [illegible] دوراں) طباعت کے آخری مراحل میں تھا کہ احقر کو جانکاہ صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔ پچاس برسوں کی رفیق حیات (لاڈلی حسن) اپنے ننہال (جبل پور، ایم پی) میں دوران قیام مختصر علالت کے بعد 16 جون 2009ء کو داغ مفارقت دے گئیں۔ (انا للہ و انا الیہ راجعون)

مرحومہ گوناگوں صلاحیتوں سے لبریز پاک سیرت خاتون کے علاوہ مختلف موضوعات پر کاغذ داغدار کیا کرتی تھی۔ ادبی سفر میں اس کا تعاون بسا اوقات دستیاب رہتا تھا۔

قارئین کرام سے ایصال ثواب کے لئے سورۃ فاتحہ کا ملتمس ہوں۔ آخر پر مرحومہ کا ایک شعر۔

لو چمن والو سنبھالو اپنا گھر
ہم چلے، لو ہم چلے، لو ہم چلے

سوگوار
حسن ساہو

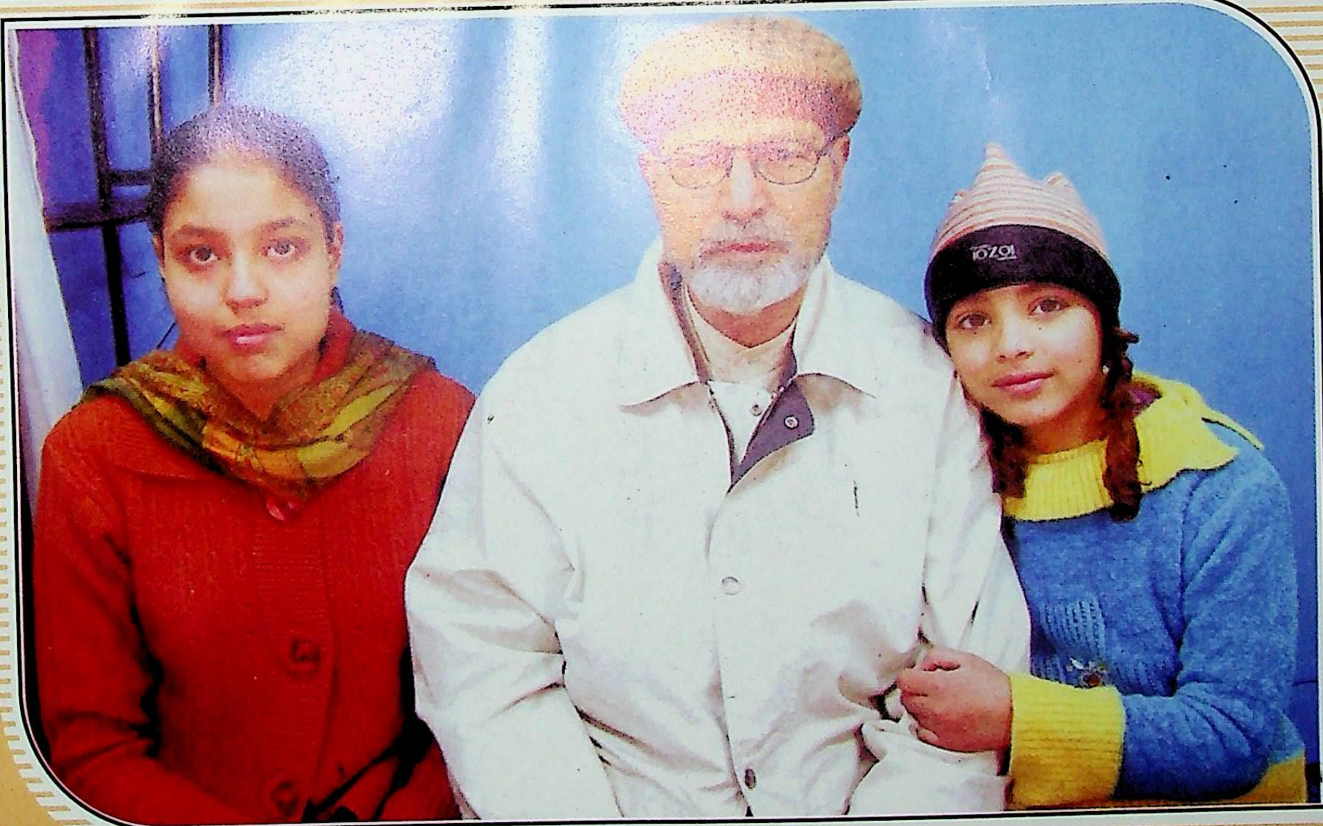


فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
217	مشورہ	۱۱
218	اپنائیت کا صلہ	۱۲
220	کڑوا سچ	۱۳
222	تارکول کا ڈرم	۱۴
225	میرے اپنے	۱۵
227	سراب	۱۶
229	رغبت	۱۷
231	مُخبر	۱۸
233	کباڑیا	۱۹
234	ہمدردی کی آڑ میں	۲۰
236	برقع پوش	۲۱
237	شناختی کارڈ	۲۲
238	دوسرا روپ	۲۳
239	سفید خون	۲۴
241	سرکار کے خیر خواہ	۲۵
243	تضاد	۲۶
245	بوجھ	۲۷
247	رفیق حیات	۲۸
250	جذباتی اندازِ فکر	۲۹
251	ہڑتال	۳۰

(۱) مولانا حسن عباس فطرت پونے (۲) مظہر امام دہلی (۳) مرحوم آنند بخشی بمبئی (۴) پروفیسر فضل امام رضوی لکھنو (۵) ڈاکٹر اکبر حیدری (۶) مرحوم حکیم منظور (۷) ہمدم کاشمیری (۸) غلام نبی خیال (۹) وجیہہ احمد اندرابی (۱۰) مرحوم عمر مجید (۱۱) آنجہانی موہن یاور (۱۲) پروفیسر مجاہداللہ خان (۳) وریندر پٹواری (۱۴) عبدالغنی شیخ (۱۵) دیپک بدکی (۱۶) ڈاکٹر رینو بہل (۱۷) اورے سرن ارمان (۱۸) مرحوم صوفی محی الدین (۱۹) مرحوم پروانہ ردولوی (۲۰) ڈاکٹر محمود شیخ (۲۱) وسیم مینائی (۲۲) ڈاکٹر سہیل انجم (۲۳) سید محمد جابر جوارسی (۲۴) مدیر ماہنامہ کتاب نُما (۲۵) مرحوم ڈاکٹر امام مرتضٰی (۲۶) راشٹریہ سہارا دہلی (۲۷) شجاع کاشمیری (۲۸) پروفیسر ہمراہ کاشمیری (۲۹) زاہدہ تقدیس فردوسی (۳۰) اوم پرکاش بجاج (۳۱) مولانا غلام حسین باقری (۳۲) ڈاکٹر نذیر مشتاق (۳۳) بے تاب جے پوری جموں (۳۴) سلیم انصاری جبل پور (۳۵) ڈاکٹر قاضی اشرف (۳۶) عبدالرشید شاہ (۳۷) خندان لکھنوی (۳۸) ہفت روزہ سیاست جموں (۳۹) اُوم پرکاش کپور، ہریانہ (۴۰) انجنیئر ارشد حسین خان (۴۱) سید سجاد حسین رضوی



رین حیدر، حسن ساہو اور نایاب امیر

انتساب

نواسی نایاب اور پوتی آفرین

کے نام

جن کی معصومانہ ڈانٹ ڈپٹ

اور تکرار نے پُرآشوب حالات

میں بھی ''گردش دوراں'' کو

ترتیب دینے کی ترغیب دی۔

پیش لفظ

(ڈاکٹر اشرف آثاری، صدر بل حضرت بل)

ریاست جموں و کشمیر نے اُردو زبان و ادب کو کئی معتبر نام دیئے ہیں موجودہ افسانہ نگاروں میں کئی نامور کہانی کار ہیں جن کی تخلیق کردہ افسانوں کو اُردو ادب میں خوب پزیرائی حاصل ہوئی ہے آج بھی ان کا تخلیقی سفر شدومد سے جاری ہے اور انہیں اور ان کے ادب پاروں کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔

کہانی کاروں کی موجودہ پود میں کچھ کہانی کار ایسے بھی ہیں جن کا ادبی سفر کم و بیش نصف صدی کے عرصے پر محیط ہے ان ہی میں ایک افسانہ نگار حسن ساہو بھی ہیں۔ حسن ساہو کے ساتھ لکھنے والے ان کے ہمعصر کچھ کہانی کار ابھی تک میدان ادب میں بڑی جواں مردی اور ہمت کے ساتھ ڈٹے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ داستان کہتے کہتے اونگھنے لگے، کچھ سو گئے اور کچھ تھک ہار کر پس منظر میں چلے گئے ہیں لیکن حسن ساہو نصف صدی گزر جانے کے باوجود بھی کارواں ادب کے ساتھ ساتھ کسی تھکن یا گھٹن کے بغیر ہی نئے افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ قدم ملا کر منزل کی جانب بڑے جوشیلے انداز میں اور بڑی پھرتی کے ساتھ سرگرمی سے رواں دواں ہیں۔

حسن ساہو کا پہلا افسانوی مجموعہ ''پھول کا ماتم'' کافی پہلے چھپ چکا ہے اور

اِسکے بعد ان کا دوسرا مجموعہ ''بستی بستی صحرا صحرا'' چھپ کر آ گیا اور پھر آج سے لگ بھگ بارہ سال قبل ۱۹۹۶ء میں ان کا تیسرا مجموعہ ''اندھا کنواں'' چھپ کر منظرِ عام پر آ گیا اور اب چوتھا افسانوی مجموعہ ''گردشِ دوراں'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ نصف صدی پر محیط حسن ساہو کی ادبی زندگی کا بھرپور جائزہ لینا یہاں ممکن نہیں ہے اور یہ کام جبل پور یونیورسٹی میں ایک طالبہ کر رہی ہے جس نے حسن ساہو کی شخصیت وفن پر اپنا مقالہ مکمل کر لیا ہے اور وہ جلد ہی اِسے ڈاکٹریٹ کے لئے پیش کرنے جا رہی ہے۔ انہوں نے اس عرصے میں کافی کہانیاں تحریر کیں لاتعداد مضامین ومقالات تحریر کئے جو مختلف موضوعات پر تھے۔ مذہب، سیاست، اخلاقیات، سماجیات، حالاتِ حاضرہ اور ملی اتحاد واتفاق وغیرہ پر۔ ملازمت سے رٹائرمنٹ کے بعد وہ جرنلزم میں مکمل طور پر آ گئے، لیکن بنیادی طور پر وہ ایک کہانی کار ہی ہیں۔ شاعری سے ان کا شغف ابتدا سے ہی تھا۔ سخن فہم ہیں لیکن یہ بات حال ہی میں منظر عام پر آئی کہ شاعری بھی کرتے ہیں۔ مقامی اخبارات کے علاوہ ان کی غزلیں وغیرہ ماہنامہ شاعر اور انشاء میں بھی چھپنے لگیں۔

''اندھا کنواں'' حسن ساہو کی ۳۳ کہانیوں پر مشتمل ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ حسن ساہو کے سینے میں ہمدرد انسان کا دل دھڑکتا ہے اپنے آس پاس کے ماحول سے اِنہیں اپنی کہانیوں کے پلاٹ بہ آسانی مل جاتے ہیں ان کا دل ایک شاعر کے دل کی طرح انتہائی نازک اور حساس دل ہے جو کسی بھی معمولی سے واقعے سے بھی متاثر ہو کر چیخ اُٹھتا ہے اور کراہتا بھی ہے اور اس کے بعد کسی بھی ایسے واقعے کا ردِعمل ہمارے سامنے ایک خوبصورت کہانی کے روپ میں ظاہر ہو جاتا ہے واقعہ جتنا متاثر کن اور سنگین نوعیت کا ہوگا اتنا ہی متاثر کن اور خوبصورت اس کا ردعمل بھی ہوگا اور اتنی ہی اچھی اور جاندار کہانی بھی

تخلیق ہوگی۔ یہ کہانی رُلانے والی بھی ہوسکتی ہے اور ہنسانے والی بھی اس کے علاوہ حسن ساہو کی کہانی قاری یا سامع کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور بھی کرتی ہے۔

حسن ساہو"اندھا کنواں" میں خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "میں خود حقیقی کہانیوں کا متلاشی ہوں" "اندھا کنواں" میں شامل ان کی اکثر کہانیوں کا تانا بانا ہمارے آس پاس کے ماحول سے ہی بُنا گیا ہے۔

اُردو زبان کے مقابلے میں جو موجودہ متمدن، ترقی یافتہ اور بڑی عالمی زبانیں ہیں ان کے نامور اور قدآور کہانی کاروں کی کثیر تعداد نے بھی اپنے سماج سے تعلق رکھنے والے غریب طبقے یا پھر مفلوک الحال کسانوں، مزدوروں وغیرہ کو ہی زیادہ تر اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ آپ روسی زبان کے مشہور کہانی کار چیخوف کی کہانیوں کو ہی لے لیجئے ان کی کہانیوں نے ہر ایک قاری کو متاثر کیا ہے کہ ان کی ایک ایک سطر گڑھی ہوئی نہیں بلکہ مبنی بر صداقت نظر آتی ہے۔ لہجہ نرم اور صاف وشفاف، زبان وبیان بالکل سادہ اور ہموار، الفاظ وتراکیب اور استعارے عام فہم اور آسان، میدانی علاقے میں گذرنے والے دریا کی روانی اور ندرت خیال، نہ خود کو بڑا عالم وفاضل پیش کرنے کے جنون میں گنجلک وثقیل الفاظ کا استعمال ہی اور نہ ہی خواہ مخواہ کا سسپنس قائم کرکے قاری کے ذہن کو اُلجھانے کی دیدہ و دانستہ کوشش ہی، نہ فلمی انداز میں مکالمہ بازی یا کہانی کا ابتداء واختتام کرنے کی سعی ہی اور نہ ہی اپنی کہانیوں میں مافوق الفطرت واقعات کی کھچڑی ڈال کر لوگوں کو ششدر وحیران کرنے کا کوئی اِرادہ یا رجحان ہیں۔

"اندھا کنواں" میں شامل افسانچہ "بدلہ" میں ایک باپ رمضان اپنی ہر ایک چیز اپنے اکلوتے انجنیئر بیٹے کی پڑھائی اور اسکی شادی کرنے پر اس اُمید پر داؤ پر لگاتا ہے کہ

اسکا بوڑھاپا آرام سے گزر جائے لیکن اس کا اکلوتا بیٹا پرویز اپنی نئی نویلی دُلہن رضیہ کے ساتھ کلب کی رنگ رلیوں میں کھو جاتا ہے اور مجبور و بےبس رمضان گلی کی نکڑ پر دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ایک اور طویل افسانے ''اندھا کنواں'' کو ہی لے لیجئے، اسی افسانے کے عنوان پر افسانوی مجموعے کا نام بھی رکھا گیا ہے۔ ''اندھا کنواں'' بھی چند برہنہ سچائیوں کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں ''اندھا کنواں'' کی مرکزی کردار آمینہ جیسی لاتعداد لڑکیوں کو روتے اور سسکتے ہوئے دیکھتے ہی نہیں بلکہ ہم میں سے ہی بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو معصوم و مجبور لاتعداد آمیناؤں کی بربادی کا کارن بن کر ان کی پاکیزہ زندگیوں کو داغدار اور جہنم زار بنا دیتے ہیں اور پھر اپنی ہوس اور عیش پرستی کی خاطر انہیں مخمل کے بستر سے اُتار کر گلی کے کسی کوڑے دان میں پھینک دیتے ہیں یہ صرف مردوں کا شیوہ ہی نہیں ہے بلکہ اس طرح کے کام میں دلال کے روپ میں رحیمن چاچی بھی میدان میں اُترتی ہے اور صمد چاچا کی امانت کی خیانت کر کے دنیا اور اپنی عاقبت واقعی خراب کر دیتی ہے۔ جوں جوں افسانہ آگے بڑھتا ہے تو قاری کو اس کے اختتام کی فکر ستانے لگتی ہے حسن ساہو نے جس انداز سے اس افسانے کا اختتام کیا ہے وہ واقعی ان کی ماہرانہ بصیرت اور اُردو افسانے کے مزاج سے بھرپور واقفیت اور گہرے مطالعے ہی کا ثمرہ ہے انہوں نے ایک مخصوص تشنگی چھوڑی ہے کہ ہر قاری کو کہانی پڑھ کر یہ فکر ستانے لگتی ہے کہ وہ جبل پور جا کر حاجی یوسف تارا کی اسٹیٹ میں آمینہ کے بارے میں دریافت کرے کہ کہانی میں جس مقام پر آمینہ کو چھوڑا گیا تھا اس سے آگے پھر اس کے ساتھ کیا کچھ ہوا یا ہو رہا ہے؟ میرے خیال میں افسانے یا کہانی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کہانی یا افسانہ نہ لگے بلکہ اس پر ایک

جیتی جاگتی سچائی کا گمان گزرے حسن ساہو اپنی لگ بھگ ہر کہانی میں اس تاثر کو برقرار رکھنے میں بالکل کامیاب نظر آتے ہیں۔

حسن ساہو جو کچھ دیکھتے ہیں اور جو کچھ محسوس کرتے ہیں اُسے دامن صفحہ قرطاس تک پہنچاتے ہیں۔ ان کا اور ایک افسانہ ''اِنسانیت کی موت'' میں ایک ہی مذہب، ایک ہی ملک وملت اور ایک ہی مسلک کے لوگوں میں سیاسی ونظریاتی اختلافات کی وجہ سے کدورت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ بھائی بھائی کا دشمن بن جاتا ہے ایک دوسرے سے شدید نفرت اور اختلاف رائے سے خاندانوں کے خاندان تباہ و برباد ہو جاتے ہیں چھوٹے بچے عورتوں اور بزرگ افراد کو بھی بخشا نہیں جاتا اور انجام کار اس کہانی کا مرکزی کردار اعجاز اپنا سب کچھ، بیوی، بچہ، گھر کھو دیتا ہے اور خود پاگلوں کی طرح اس سارے ہنگامے کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا ہے کہ آخر وہ اس کی بیوی، بچہ جنہیں یہ سخت ترین سزا مل گئی کہاں تک اپنی ناکردہ گناہوں کے لئے ذمہ دار تھے؟ وہ ایک سوالیہ نشان بن جاتا ہے اور اپنے ان ناکردہ گناہوں کی سزا پا کر اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے مصنف اس کہانی کے ذریعے جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اپنے مخصوص کریدنے اور تڑپانے والے انداز میں کہہ دیتے ہیں گویا ایک سرجن کی طرح نشتر سے گلے سڑے زخم کو کرید کرید کر یہ احساس دلاتے ہیں کہ جو ناسور ہمارے سماج کی رگوں اور ریشوں میں پھیل رہا ہے یا پھیل چکا ہے اس کی طرف فوری توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ یہاں یہ بات بھی عرض کرتا چلوں کہ اسطرح کی سچویشن افسانے میں پیدا ہو جانے پر اگر کہانی کار کی اپنی ذاتی رائے یا خیال، غیر شعوری طور پر یا پھر کہانی کے پلاٹ کے تقاضے کو مدنظر رکھ کر در آئے تو اس سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کی قطعی کوئی گنجائش نہیں کہ متعلقہ کہانی کار کا لب ولہجہ ناصحانہ ہے یا

پھراس کا اظہار خیال خطیبانہ ہے۔ یا پھر وہ ایک کہانی کار کم اور مبلغ زیادہ ہے جیسے کہ کچھ ہمعصر کہانی کاروں کو حسن ساؔہو کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے۔

''زندگی کا کرب'' ایک عمدہ کہانی ہے اس کہانی کو اول تا آخر کئی بار پڑھنے کے بعد عام قاری اپنی سوچ و فکر کی گہرائیوں میں متواتر غوطے کھا کر یہ طے کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے کہ کہانی کا عنوان زندگی کا کرب اس کہانی کے مرکزی کردار ڈاکٹر ارشدؔ یا اسکی مریضہ نسرینؔ یا پھر نسرینؔ کی والدہ کی زندگی کا کرب ہے؟ یا پھر اُن تینوں کرداروں کی زندگی کا کرب ہے؟ کچھ بھی ہو ان تینوں کرداروں کی زندگیوں کے کرب کو سب لوگوں کی زندگیوں کا کرب بنانے میں مصنف کامیاب ہو چکے ہیں۔

''اندھا کنواں'' میں شامل ہر ایک کہانی اُردو افسانے کے معیار پر پورا اُترتی ہے اور ہر ایک کہانی منفرد اور الگ الگ موضوعات اور مسائل پر لکھی گئی ہے اور ایک اچھوتے انداز میں لکھی گئی ہے۔ حسن ساؔہو کی کہانیوں میں کئی خوبیاں ہیں اگر زبان و بیان کے لحاظ سے دیکھا جائے تو فوراً یہ احساس ہو جاتا ہے کہ حسن ساؔہو کے آگے اُردو زبان وادب کا پچاس سالہ مطالعہ واقعی رنگ لایا ہے خوبصورت اور برمحل الفاظ و تراکیب اور محاوروں کا استعمال اور انکے باہمی ربط و امتزاج کا خوب خیال رکھنا اُنہیں خوب آتا ہے۔ خواہ کوئی واقعہ کتنا بھی مشکل کیوں نہ ہو یہ بھرپور تاثر ملتا ہے کہ مصنف ایک کمینٹیٹر کی حیثیت سے نہیں بول رہے ہیں اور نہ ہی ایک داستان گو یا پھر تماشہ بین بن کر کچھ بیان کر رہے ہیں۔ بلکہ ایک ایسے شخص کی طرح اپنے اندرونی جذبات و احساسات کو زبان دے رہے ہیں بالکل ایسے جیسے یہ سب کچھ، جسے وہ بیان کر رہے ہیں ان کی خود اپنی ذات پر بیت رہا ہو۔ شاید یہ بھی ایک خاص وجہ ہے کہ حسن ساؔہو کی اس طرح کی اکثر تحریریں کافی متاثر کرتی ہیں اور

قاری کو اپنے ساتھ بہت دور تک سبک رفتاری اور خوشگوار موڑ میں بہا کر لے جاتی ہیں۔

اسی طرح حسن ساہو کے تازہ افسانوی مجموعے ''گردشِ دوران'' میں شامل کہانیاں بھی بہت متاثر کرتی ہیں جنہیں پڑھ کر حسن ساہو کی نئی اور تروتازہ سوچ کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ ''گردشِ دوراں'' میں شامل گردش دوراں، بیدار مغز، مین ہول، بوجھ، اپنائیت کا صلہ، تارکول کا ڈرم، ماں بننے کا خواب، تصویر کا دوسرا رُخ، ہمسفر، گرکٹ صفت، مندر سے مسجد تک، رغبت بھنورا، وغیرہ سبھی افسانے اور افسانچے یا منی افسانے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں خاص طور پر ''امانت'' ایک عمدہ کہانی ہے جس کہانی کا ہر کردار اپنے مقدور کے مطابق ہی کہانی کو ایک خوبصورت انجام تک لے جاتا ہے۔ مذکورہ افسانوں میں اکثر افسانے ملک کے مقتدر اُردو رسائل وجرائد میں وقتاً فوقتاً چھپ بھی گئے ہیں اور اُردو قارئین کے ایک بہت بڑے طبقے کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ لیکن اب مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کہانیاں سب کتابی صورت میں منظر عام پر آگئی ہیں اور ''گردشِ دوران'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

حسن ساہو سوچ سمجھ کر کہانیاں لکھتے ہیں وہ صرف اسلئے کہانیاں نہیں لکھتے ہیں کہ رسائل ور جرائد میں اپنی حاضری لگا سکیں یا پھر انہیں کہانی لکھنے کی لت پڑ گئی ہے یا پھر کسی بھی طرح کی کہانی لکھنے سے وہ اپنے ہونے کا احساس دلانا چاہتے ہیں بلکہ وہ کہانی صرف اسلئے لکھنا چاہتے ہیں یا لکھتے ہیں یا لکھنے کے لئے مجبور ہوجاتے ہیں کہ انہیں کوئی ایسا واقعہ مجبور کردیتا ہے کہ وہ کہانی لکھیں انہیں کوئی فکر، کوئی سوچ تڑپا دیتی ہے متاثر کرتی ہے تو وہ ہمیں ایک خوبصورت کہانی دیتے ہیں۔ ان کی کہانیاں اسی طرح کے واقعات کی پیداوار ہیں وہ کہانی کے پلاٹ کے پیچھے پیچھے نہیں بھاگتے بلکہ کہانی کا پلاٹ ہی ان کے پیچھے پیچھے

بھاگتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کی اکثر کہانیاں کسی رونما ہونے والے واقعے یا حادثے کا افسانوی روپ ہوتی ہیں اسلئے زندگی سے قریب سے قریب تر نظر آتی ہیں۔ کوئی اساطیری یا الف لیلوی داستان نہیں ہوتیں اور ان میں عام لوگ جیسے کردار ہی نظر آتے ہیں۔ ہمارے آگے پیچھے، دائیں بائیں، چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے والے کردار زیادہ تر متوسط طبقے یا پھر غریب و مفلس اور نادار و مجبور لوگ جنکی زندگیوں کا ہر ایک گزرنے والا پل بذات خود، ایک کہانی، ایک افسانہ ایک روداد ہوتا ہے جن کی ایک ایک حرکت ایک ایک افسانے کو جنم دیتی ہے۔ سماج یا معاشرے میں ہر طبقے کے لوگ طرح طرح کی کہانیوں کو جنم دیتے ہیں لیکن جو کہانیاں یا جو کردار ہمارے دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں یا بہت دیر تک حاوی ہو جاتے ہیں ہماری اندر کی انا اور ہماری روح کو متاثر کرتے ہیں وہ زیادہ تر سماج کے انہی مفلس و نادار لوگوں کی کہانیوں کے کردار ہوتے ہیں۔ زندہ رہنے کے لئے ایک ایک سانس سے اُلجھنے والے اور ایک ایک سانس کی مہنگی سے مہنگی قیمت ادا کرنے والے کردار اُردو کے مشہور و معروف اور صفِ اول کے کہانی کار پریم چند بھی معاشرے کے اسی طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے گھروں میں جھانک کر ان کا دُکھ درد سمیٹتے تھے۔ حسن ساہو بھی زیادہ تر اسی مجبور و بے بس سماج کے مسائل کی عکاسی میں مصروف نظر آتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہر دس برس کے بعد ترقی یافتہ یا ترقی پذیر زبان پر کوئی نہ کوئی جدید رجحان یا تحریک غالب آتی ہے۔ اس طرح شاعر یا ادب یا فنون لطیفہ سے وابستہ دیگر تخلیق کار کسی نہ کسی تازہ وارد ہونے والی تحریک سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ حسن ساہو اپنے پانچ دہائیوں پر محیط ادبی سفر کے دوران کسی بھی تحریک یا کسی بھی ازم سے وابستہ نہ ہوئے۔ ہمیشہ بس اپنی ہی دھن میں مگن رہے اور لکھتے رہے۔

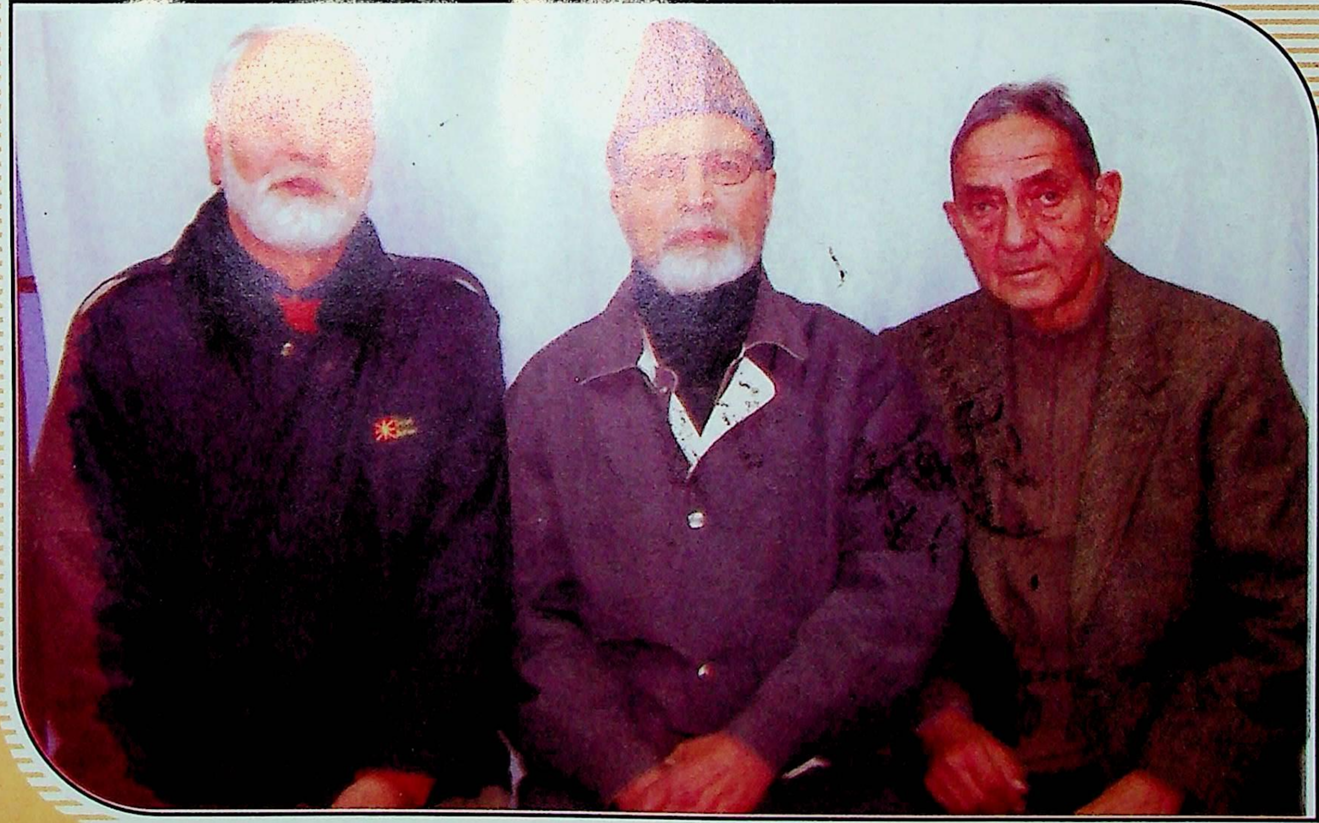
حسن ساہو کی کہانیاں اُن کے بھر پور تجربے، صحت مند فکر و سوچ، وسیع و عریض مطالعے اور بھر پور مشاہدے کی غمازی کرتی ہیں اُردو ادب کے قلمکاروں اور تخلیق کاروں کے فن پاروں کی خوبیوں اور محاسن کو ان کے گذرنے کے بعد پرکھنے اور دیکھنے سمجھنے کا جو رجحان ہمارے ہاں ابتداء سے ہی ہے اگر ایسا ان کی زندگیوں میں ہی ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ حسن ساہو اس ضمن میں خوش قسمت ہیں کہ ان پر ریاست سے باہر کام ہو رہا ہے۔ جیسا کہ میں اوپر بھی عرض کر چکا ہوں اُمید ہے کہ یہ چند باتیں بھی ان کی شخصیت و فن کے متعلق انہیں سمجھنے اور پرکھنے کے ضمن میں کارآمد ثابت ہونگیں۔

اشرف آثاری

۳۰، مارچ ۲۰۰۹ء



نور شاہ، حسن ساہو اور ڈاکٹر اشرف آثاری



مندر سے مسجد تک

جبل پور (مدھیہ پردیش) کے گنجان آباد علاقے بھرتی پور میں اپنے سسرال کا مسکن ہے

بھرتی پور کی بستی دراصل ملی جلی تہذیب وتمدن کا گہوارہ بنی ہوئی ہے۔ ملک آزاد ہونے سے اب تک مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد اس علاقے میں سکونت پذیر ہیں۔

بھرتی پور جنرل روڈ تو سیکولر ملک کی ایک قابل تقلید نشانی سے کم نہیں۔ بڑی اومتی چوک سے لے کر گلگلہ چوک تک پھیلی لگ بھگ ایک فرلانگ سڑک کے دونوں جانب دکانوں اور بڑی چھوٹی عمارتوں کے علاقہ میں مختلف مذاہب سے وابستہ عبادت گاہیں اپنے ہونے کا اعلان کر رہی ہیں۔

اس سڑک کے پہلے چوک پر درگا مندر اور دوسرے چوک پر مینار والی مسجد مداحوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں پیش پیش ہے۔ مندر اور مسجد کے درمیان ایک گرجا گھر ایک گردوارہ اور سندھی برادری کا تعمیر کردہ جھولے لال مندر بھی ہے۔

عموماً مشاہدے میں آیا ہے کہ الگ الگ عقیدوں کو دلوں میں پالنے والے اس بستی کے مکین ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ اور خوشی وغم سے متعلق تقریبات میں بڑھ چڑھ کر

حصہ لیا کرتے ہیں۔

سالہا سال سے محبت واخلاص سے لبریز ماحول دیکھنے کو ملتا رہا۔ بارہا دل نے چاہا کہ کاش اس طرح کی اخوت ورواداری ملک کے دوسرے حصوں میں بھی دیکھنے کو ملتی۔

عبادت گاہوں والی اس سڑک پر بھکاریوں کی تعداد بھی بہت زیادہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ صبح سویرے مسجد ومندر کے سامنے وہ عبادت کرنے والوں کے آگے دست سوال دراز کرتے رہتے ہیں۔ مخصوص اوقات پر گرجا گھر اور گردوارہ کے روبرو غریب ونادار لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ حالانکہ ان بھکاریوں میں مسلمان، عیسائی، ہندوسکھ سب مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد ملتے ہیں لیکن ہم پیشہ ہونے کے باعث وہ ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں بلا امتیاز رنگ ونسل بھرپور حصہ لیا کرتے ہیں۔ اگر رحیم کو مصیبت سے واسطہ پڑا تو پیٹر، اوتار، یا رام داس کو بیقراری اپنے چنگل میں لے لیتی، وہ تڑپ اُٹھتے۔ البتہ ان بھکاریوں میں ایک شخص نہایت ہی سنجیدہ مزاج اور صاف گو مانا جاتا ہے۔ اِسے ہر مذہب سے ایک خاص قسم کا لگاؤ رہا ہے۔ لغویات وفضولیات سے الگ تھلگ ہر مذہب کے بنیادی اصولوں وقدروں کی رکھوالی کرنا وہ اپنا فرض جانتے ہیں۔ لوگ اِسے ''بیساکھی والے بابا'' کے نام سے یاد کیا کرتے ہیں۔ معذور ہونے کے باعث بیساکھی کے سہارے چلتے ہیں۔ بیساکھی والے بابا ہر مذہب کی تقریبات میں بھرپور حصہ لیا کرتے ہیں۔ وہ کسی خاص عقیدے سے وابستہ نہیں یہی وجہ ہے کہ جبل پور شہر میں ان کی ہر کوئی عزت کرتا ہے۔

سننے میں آیا ہے کہ بیساکھی بابا گرجا گھر کے پاس گروندی بازار کے نکڑ پر لاوراث بچے کی صورت میں ولیم پادری کو ملے تھے۔ وہ بھرتی پور کی رنگا رنگ تہذیب میں پلتے رہے

اور پھر ہر عبادت گاہ میں جا کر وہ اچھی باتوں کو لڑکپن سے ہی سنتے آئے ہیں۔ ان کے خیالات میں بہت ہی وسعت و گہرائی پائی جاتی ہے۔

''کیوں بابا'' آپ اصلیت میں کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں؟ ایک روز ایک روپے کا سکہ ان کے کشکول میں ڈالتے ہوئے میں نے پوچھ ہی لیا۔

''صاحب! مذہب کیا ہے اس مالک و داتا کو پہچاننے کا ایک ذریعہ ہے۔ آخری منزل تک سفر کرنے کا ایک راستہ ہے۔ بھلائی کرو، بدی سے دور رہو، سچ بولو، اور ہر ایک سے محبت جتاؤ، ایسا کرنے سے تو میرے خیال میں ہر مذہب کی پیروی ہو سکتی ہے اور مالک کی خوشنودی حاصل کی جا سکتی ہے۔''

''لیکن پھر بھی اپنی پہچان کی خاطر کسی ایک مذہب سے وابستہ رہنا لازمی ہے'' میری رگ تجسس پھڑک اٹھی۔

''صاحب سب مذاہب وعقیدوں سے بڑھ کر بھی ایک عقیدہ ہے ایک مذہب ہے اور وہ ہے انسانیت کا جس نے انسانیت کی راہ کو اپنایا اس نے داتا اور جگ کے مالک کی خوشنودی حاصل کر لی''

اس کے مدلل جواب کے آگے میں لاجواب ہو گیا۔ ہر مذہب کے لوگ تو درکنار خود پنڈت، مولوی، پادری اور گیانی جی تک ان کے ارفع خیالات کی قدر کیا کرتے ہیں۔

جب بھی میں جبل پور جاتا۔ اپنے فالتو وقت کا کچھ حصہ بیساکھی بابا کی صحبت میں گزارنے کی کوشش کرتا۔ ان کے سمجھانے کا ایک خاص انداز ہے۔ وہ ہر شخص کو اس کے مذہب و عقیدے کے مطابق ہی نصیحت کیا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر کوئی ان کی بات کا مان رکھتا آیا ہے۔

برسہابرس سے درگا رمندر کے قریب ہی لکشمی ٹاکیز موجود تھی۔اس شیطان گھر کو بند کروانے کے لئے کچھ برس قبل ہر فرقے کے لوگوں نے بھر پور انداز میں مہم چلائی۔ احتجاج سے کام لیا۔لیکن خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوسکا۔

آخر کار بیساکھی بابا نے سینما گھر کے مالک دیوان جی کو اس کی عالیشان کوٹھی پر جا کر سمجھایا۔

''دیوان جی! آپ کو پرتما نے بہت کچھ دیا ہے۔ذرا غور کرو کہ اپنی یہ چھوٹی سی بستی عبادت گاہوں کی وجہ سے متبرک جگہ بن چکی ہے۔مندر اور گرجا گھر کے پڑوس میں سینما گھر کا ہونا کیا زیب دیتا ہے؟ عبادت گاہوں کے تقدس کو بنائے رکھو گے تو بھگوان آپ کو سُکھ ہی سُکھ سے نوازے گا۔''

بیساکھی بابا کی باتوں میں نہ جانے کون سا جادو تھا کہ دیوان جی نے سینما کی بلڈنگ سستے داموں مقامی ٹرسٹ کے ہاتھ فروخت کردی۔اس بلڈنگ میں غلہ اسٹور ہوتا ہے اور سڑک کی جانب دکانیں تعمیر کردی گئی ہیں۔

اسی طرح ایک بار سسرال جانے کا اتفاق ہوا تو بازو والے جھولے لال مندر میں لاؤڈ اسپیکر پر ''ہرے رام۔۔۔ ہرے رام۔۔۔رام۔۔۔راما۔۔۔ ہرے کرشن۔۔۔۔ ہرے کرشن۔۔۔۔کرشن کرشنا،'' کچھ دنوں سے یہ جاپ بلاناغہ جاری تھی۔دن میں عورتیں اور رات کو مرد جاپ میں حصہ لیتے۔

گیانی پان والے سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ سلسلہ دس روز تک جاری

رہے گا۔ یقین کیجئے چوبیس گھنٹے کے شور وغل نے خاص کر میری ساس کو زیادہ ہی پریشان کر رکھا تھا۔ جو کچھ ماہ سے بستر علالت پر دراز پڑی تھی۔

کسی ایک نے بھی جرأت نہیں کی کہ اس جاپ کے خلاف احتجاج کرے اور کرتا بھی کیسے جبکہ ہر مذہب کے ماننے والے کچھ متبرک دنوں میں لاوڈ اسپیکر پر گھنٹوں پروگرام نشر کیا کرتے ہیں۔

> ''کوئی مذہب اجازت نہیں دیتا کہ اپنے ہمسایہ کو کسی طرح کی تکلیف پہنچائے۔ ہوسکتا ہے کہ پڑوس میں کوئی بیمار ہو یا کوئی طالب علم پڑھ رہا ہو۔ تو اس طرح کے شور سے بُرے نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ اگر متواتر کچھ دنوں تک ریاضت کرنی ہے تو موزون رہتا کہ لاوڈ اسپیکر کا استعمال نہ کیا جائے۔

بیساکھی بابا کی باتیں سُن کر جھولے لال مندر کے منتظمین کو کچھ احساس ہوا اور اس کے بعد لاوڈ اسپیکر کا استعمال رات کے لئے بند کر دیا گیا۔

ویسے اس بار مہر و محبت بھری بستی کے تیور کچھ بدلے بدلے نظر آئے۔ نہ رواداری کے وہ چرچے اور نہ خلوص کے وہ میٹھے بول، سارے بازار کا ماحول ہی بدلا بدلا نظر آیا۔ گویا ہر کوئی ایک دوسرے کو شک کی نگاہوں سے دیکھ رہا ہو۔ کسی ایک سے اس بابت پوچھ تاچھ کرنے کے بجائے میں نے بیساکھی بابا کی جھونپڑی کا رُخ کیا۔ ان سے بدلے ہوئے ماحول کی بات کیا چھیڑی کہ بابا حسرت بھری نظروں سے مجھے گھورنے لگے۔ کچھ وقفے سکوت میں گزارنے کے بعد انہوں نے زبان کھولی۔

''مرحوم ڈی ،او شکور صاحب کے داماد ہونے کے
ناطے تم اس بستی کے بھی داماد ہو پھر تم سے کیا چھپانا۔۔۔
دراصل پنجاب، آسام اور کشمیر وغیرہ میں رونما ہونے
والے حالات نے عام لوگوں کے دلوں میں نفرت و
کدورت کے بیج بو دیئے ہیں۔اس پر طرہ یہ کہ اجودھیا
میں ایک عبادت گاہ کو شہید کر کے دوسری عبادت گاہ تعمیر
کرانے کا ناپاک منصوبہ روبہ عمل لایا جارہا ہے۔فرقہ
وارانہ فسادات میں بہت سے بے گناہ اور معصوم افراد کو
لقمہ اجل بننا پڑا۔یہی وجہ ہے کہ کچھ حساس لوگوں کے
دلوں میں بے اعتمادی و گمراہی سمانے لگی۔لوگ ہر معاملہ
میں ایک الگ انداز سے سوچنے لگے۔ ارباب اختیار
فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا دے رہے ہیں۔اب تو اس
نفسانفسی کے عالم میں تو مذہبی، انسانی اور اخلاقی قدروں
کا دُور دُور تک نام و نشان نہیں ملتا۔اس سب کا اثر اپنی
بستی کے مکینوں نے بھی لیا ہے۔''

کتنی سچائی تھی بابا کی باتوں میں ۔جہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے ایک دوسرے سے بدظن نظر آئے وہاں بھکاری لوگ اب بھی ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے۔ان کے درمیان نفرت و کدورت کی دیوار کھڑی نہ ہو سکی۔

پچھلے ہفتہ ایک اچھا خاصہ ہنگامہ دیکھنے کو ملا۔ہوا یوں کہ ایک فرلانگ سڑک پر

مینار مسجد وجھولے لال مندر کے مابین ایک شراب کی دکان بھی ہے۔لوگ چاہتے تھے کہ اس سڑک کے تقدس کے پیش نظر شراب کی اس دکان کو ہمیشہ کے لئے بند کروایا جائے۔

مسجد و مندر کے منتظمین نے بھی اس نیک ارادے کو سراہا۔اسی واقعے کولیکر کچھ آوارہ فطرت نوجوانوں کے درمیان خاصا جھگڑا ہوا۔ باتوں باتوں میں جھگڑا بڑھ گیا مقامی پولیس کی موجودگی میں چھرے چلے اور نتیجے میں یادو نام کا غنڈہ زخموں کی تاب نہ لاکر چل بسا۔اس کا حریف اکبر بھی زخموں سے چور خون میں لت پت پڑا تھا۔ پولیس نے یادو کی لاش اور اکبر و دیگر زخمیوں کو وکٹوریہ اسپتال پہنچایا۔

اب ہندو مسلم رواداری کی نہج ترک کر کے لوگ ایک دوسرے سے کھچے کھِچے رہنے لگے۔ کچھ لوگ اس واقعے کولیکر جھگڑا بڑھانے کی فکر میں تھے۔اسی دوران نوجوانوں اور بچوں پر مشتمل ایک گروہ ہاتھوں میں بھالے اور پتھر لئے گلیوں میں احتجاجی گشت کرنے لگا۔

''نعرہ تکبیر۔۔۔ اللہ اکبر۔۔۔۔ آواز دو ۔۔۔ ہم ایک ہیں۔۔۔'' ''مسلم سے جوٹکرائے گا وہ پاش پاش ہوجائے گا۔''

اتنے میں پیپل والی گلی سے اسی طرح کی ایک اورٹولی برآمد ہوئی۔

ہر ہر مہادیو۔۔۔۔۔ جے مہا کالی۔''

تیار کرو جوانوں کو۔۔۔ بھگادو مسلمانوں کو۔''

''بھارت میں گر رہنا ہے۔''

''بندے ماترم کہنا ہے۔''

غرض نفرت اور انتقام کا ماحول پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا اور اس تشویشناک صورت حال کو سنبھالنے کی کسی مولوی، پنڈت، پادری یا گیانی نے کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ بس دیوان خانوں یا عبادت گاہوں میں مقید امن وآشتی کے پیغام جاری کرتے رہے۔ کچھ سیاسی شعبدہ باز تو ان بگڑے حالات کا فائدہ اُٹھانے کی کوشش میں تھے تاکہ اس معمولی سے واقعہ کو لے کر سارے شہر میں فساد برپا کردیا جائے۔

اچانک وکٹوریہ اسپتال سے ملحق گاندھی پارک میں لوگوں نے جمع ہونا شروع کیا۔ پبلک لائبریری سے نکل کر میں بھی لوگوں کی بھیڑ کا ایک حصہ بن گیا۔

اشتعال انگیز فقرے کسے جانے لگے۔ کچھ بزرگ لوگ معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش میں تھے۔ لیکن منافرت سے لبریز ماحول میں خاطر خواہ تبدیلی دیکھنے کی نہیں ملی۔

اتنے میں جبکہ میں بچ بچا کر گھر جانا چاہتا تھا بیساکھی بابا کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔

"کیا ہوا ہے تم لوگوں کو، کیوں معمولی سے معاملے کو
لے کر ایک دوسرے کے جانی دشمن بننے پر تلے ہوئے۔"

نہ جانے بیساکھی بابا کی آواز میں کیا جادو تھا۔ آن واحد میں سب کی زبانوں پر تالے پڑ گئے۔ ہوا میں لہرانے والے ہاتھ نیچے آ گئے اور لوگوں کے جم غفیر کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

"ارے نادانو یہ تو جاننے کی کوشش کرو کہ جھگڑا کس
بات پر ہوا ہے؟ یادو یا اکبر تو نامی غنڈے ہیں۔ غنڈہ
گردی کرنا ان کا پیشہ ہے۔ کیا تم میں سے اکثر نہیں

جانتے کہ جوا کھیلنا، دارو پینا اور راہ چلتی لڑکیوں کو چھیڑنا
ان پر آوازیں کسنا ان جیسے آوارہ صفت لوگوں نے اپنا
دھرم مان لیا ہے۔ یادو نام کا ہندو تھا۔ جبکہ اکبر نام کا
مسلمان ہے۔ ان کے لئے تم لوگ اپنے برسوں کے
خوشگوار تعلقات بگاڑنے کی سوچ رہے ہو۔ بیوقوف بن
کر مہر و محبت کی پھلواری کو نفرت کی آگ میں جلانے کی یہ
کوشش بہت مہنگی پڑے گی۔ ہوش کے ناخن لو۔''

بیساکھی بابا کی نصیحت سن کر لوگ سر نیچا کئے چور نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اتنے میں کسی شرپسند نے تیز دھار والے ہتھیار سے بیساکھی بابا پر حملہ کر دیا۔ اور خود بھیڑ میں غائب ہو گیا۔ گویا جب لوگوں میں انتقامی جذبہ مدھم پڑنے لگا تو کرائے کے ٹٹو نے ماحول بگاڑنے اور اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر بیساکھی بابا پر وحشیانہ حملہ کر دیا۔ اِسے بیہوشی کی حالت میں وکٹوریہ اسپتال لایا گیا۔ لوگ سوچنے لگے کہ بیساکھی بابا کے مرنے کے بعد اِس بستی کے لوگوں پر نہ جانے کون سی آفت ٹوٹے گی۔ تمام لوگ وکٹوریہ اسپتال کے وسیع احاطے میں جمع ہو گئے۔

اِدھر بیساکھی بابا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے اور اُدھر مولوی، پنڈت اور دیگر مذہبی ٹھیکہ دار دبی آواز میں اپنی اس خواہش کا اظہار کرنے لگے کہ اگر بیساکھی بابا سدا کی نیند سو گئے تو آخری رسومات ان کے مذہب کے مطابق ادا کی جائیں۔ غرض مسلمان اور عیسائی چاہتے تھے کہ ان کے بے جان بدن کو ان کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ باقی لوگ اُنہیں نذرِ آتش کرنا چاہتے تھے۔ اس بات کو لیکر پھر سے ہنگامہ کھڑا ہونے لگا۔

پنڈت اور گیانی ایک طرف اور پادری و مولوی دوسری طرف۔ ان کے ساتھ بستی کا نوجوان طبقہ خفیہ طریقے پر نفرت کے بیج بونے میں پھر سے مصروف نظر آنے لگا۔

باتوازن ماحول میں پھر سے کشیدگی سمانے لگی۔ نہ جانے یہ بدلے بدلے حالات کون سا روپ اختیار کر لیتے کہ ڈاکٹر سونکر کی آواز نے سب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

''مالک کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بیساکھی بابا کو ہوش آ گیا ہے اور اب وہ خطرے سے باہر ہیں البتہ خون کافی مقدار میں بہہ جانے کے سبب مزید خون کی ضرورت ہے۔ دس بارہ نوجوان میرے ساتھ اندر آ جائیں۔ مناسب مقدار میں خون جسم میں داخل ہونے کے بعد بیساکھی بابا بہت جلد صحت یاب ہو سکتے ہیں۔''

ڈاکٹر کی بات سُن کر لوگوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ پنڈت، پادری، مولوی و گیانی جی ایک ایک کر کے احاطے سے باہر آنے لگے اور دیکھتے دیکھتے بیساکھی بابا کو ٹوٹ کر چاہنے والے اکثر افراد ایسے غائب ہو گئے کہ جیسے وہ اُنہیں جانتے بھی نہ ہوں۔

البتہ رحیم، اوتار، رام داس، فرنا ڈیز اور بھیکو وغیرہ بھکاریوں کی ٹولی جمی رہی اور وہ سب بھرپور خلوص نیک جذبے کے ساتھ ہسپتال کے اندر چلے گئے۔ اپنے ہم پیشہ ساتھی ''بیساکھی بابا'' کی زندگی بچانے کی لگن میں۔ انسانیت ان کا دھرم ہے اور رواداری ان کا مذہب ---اور--- وہ--- ایک انسان کو بچانا چاہتے تھے وہ بھی انسانیت کے ناطے۔



ملاپ

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی ۔ آن کی آن میں آسمان کی وسعتوں میں کالے بادل چھانے لگے اور بجلی کی کڑک نے رات کو اور بھی خوفناک بنادیا۔ آندھی اور طوفان میں مقید رات، ہر طرف اندھیرا اور سناٹا، وحشت ناک خاموشی ہر سو چھانے لگی۔ الغرض رات ایک نئی نویلی بیوہ کی طرح سیاہ لبادہ اوڑھے اور بال کھولے کراہ رہی تھی۔

عاصفہ بھی ایک بیوہ تھی

اُس کا کوئی پرسان حال نہ تھا

آج لگا تار کئی دنوں سے عاصفہ بستر مرگ پر پڑی کروٹیں بدل رہی تھی۔ وہ درد سے کراہ رہی تھی

اُس میں اُٹھنے کی طاقت نہ تھی

ایک اکیلا ننھا سا سہارا راکب اس کی گود سے چسپاں سو رہا تھا۔ زبردست آندھی کے شور نے راکب کی نیند اُچاٹ کردی۔ وہ مارے خوف کے تھرتھرا اُٹھا۔ اُس کے منہ سے نکلا

"ماں"

بدلے میں عاصفہ نے اُس کے معصوم بدن پر اُپنا لاغر ہاتھ پھیرا اور راکب سہمے

ہوئے پرندے کی مانند خاموش ہو گیا۔ ہوا کے تند و تیز جھونکوں سے اپنے بچے کو محفوظ رکھنے کی نیت سے عاصفہ بصد مشکل چارپائی سے اُٹھی۔۔۔ آہستہ آہستہ بلکہ گرتے ہوئے کھڑکی تک پہونچی اور اُس کے کھُلے پٹ بند کر دیئے۔ واپس مُڑی تو کسی چیز سے ٹھوکر کھا کے فرش پر ایسے گری کہ پھر اُٹھ نہ سکی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کے تیز جھونکے نے کھڑکی کے پٹ پھر سے کھول دیئے اور طاق پر رکھا ٹمٹماتا چراغ بُجھ گیا۔ بے بسی کے عالم میں عاصفہ ہمیشہ کی نیند سو گئی اور راکب کو بے آسرا چھوڑ گئی۔

راکب بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا جیسے کسی نے اُس کے منہ پر تھپڑ مار کر جگا دیا۔

''ماں! تم کہاں ہو ماں''۔ راکب کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ اِتنے میں بجلی اِس انداز سے چمکی کہ اُس کی روشنی میں راکب کی نظر ماں پر پڑ گئی جو اوندھے منہ بے حس فرش پر پڑی تھی۔ اُس نے ماں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کرتے ہوئے کہا۔

''اُٹھو ماں! مجھے ڈر لگتا ہے، اُٹھتی کیوں نہیں ہو ماں!
میں راکب ہوں، تمہارا بیٹا، ماں کیا مجھ سے روٹھ گئی ہو۔
میں اَب دودھ نہیں مانگوں گا۔ میں تنگ بھی نہیں کروں
گا۔۔ مگر اب تم اُٹھو ماں۔۔۔''

راکب روتا رہا۔ بجلی کڑکتی رہی اور ماں کا بے جان جسم کھردرے فرش پر پڑا رہا۔ ساتھ ساتھ دنیا کے رکھوالے چُپ چاپ تماشہ دیکھنے میں محو تھے۔

اگلے روز عاصفہ کی تجہیز و تکفین کے بعد راکب کو اُس کے چچا اپنے گھر لے آئے۔ رشید میاں محکمہ آبپاشی میں ملازم تھے اور اپنی بیوی عابدہ کی شرکت میں زندگی اچھے انداز سے کٹ رہی تھی۔ رشید میاں کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی جس کا اُسے اُس کی بیگم عابدہ کو

کافی دُکھ تھا۔ آستانوں پر ناک رگڑنے، خانقاہوں پر نیاز چڑھانے اور پیر فقیروں کی دِلجوئی کرنے پر بھی چھ برس گذرنے کے بعد بھی اُن کی مُراد بر نہ آئی۔ عابدہ چھوڑ رشید نے بھی اولاد کی کمی کو کئی بار شدت سے محسوس کیا لیکن اس کمی کو پورا کرنا اُن کے بس کی بات نہ تھی۔

''جانے اولاد کی صورت دیکھنا نصیب بھی ہوگی یا نہیں۔

کیوں نہ راکب کو ہی اولاد کا درجہ دیا جائے۔''

اس خیال کو دل و ذہن میں بسائے رشید میاں راکب کو اپنے گھر لایا تھا۔ راکب کو اس نئے گھر میں ہر طرح کا سُکھ و آرام ملا۔ اور اِس آسائش و راحت کے باعث راکب اپنی ماں کی یاد کو کسی حد تک فراموش کر بیٹھا۔ پیار و انسیت کے عالم میں غرق راکب تعلیم و تربیت کے میدان میں آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔

کئی بہاریں آئیں اور چلی گئیں۔۔۔ زندگی کا سفر جاری رہا۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ راکب کے دل میں چاچا اور چاچی کے لئے محبت واحترام کی شمعیں روشن ہوتی گئیں۔

وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔ راکب نے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبرات کے ساتھ پاس کرلیا۔ وہ مستقبل کے تانے بانے بُننے میں مشغول تھا کہ یہ مژدہ سُننے کو ملا کہ اُس کی چاچی عابدہ برسوں بعد ماں بننے کی دہلیز کو چھونے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ اُس کردگار نے اپنے فیض وکرم سے عابدہ کو چاند سا بیٹا عطا کیا۔ اِس خوشی کو دوچند کرنے کی خاطر رشید میاں نے بڑے پیمانے پر احباب کی دعوت کا اہتمام کیا۔۔۔ کوٹھی کا وسطی ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ قہقہوں اور مسرت آمیز باتوں سے سارا ہال گونج رہا تھا۔ اس خوشی کے

ماحول میں راکب بھی برابر میزبان کی حیثیت سے ہر ایک سے خوش اسلوبی کے ساتھ پیش آتا رہا۔ دراصل وہ بھی خوش تھا کہ مدتوں بعد اُسے بھائی مِلا ہے چھوٹا بھائی۔ مہمانوں سے نپٹنے کے بعد راکب نے خوشی وانبساط میں سرشار معصوم کو پیار کرنے کی غرض سے گود میں اُٹھالیا۔

''اے، گرا دے گا میرے ننھے کو''

عابدہ نے بدلے بدلے انداز کے ساتھ بچے کو راکب کی گود سے کیا لیا کہ راکب دیکھتا رہ گیا۔ موقع کی نزاکت سمجھتے ہوئے اُس نے خاموشی اختیار کرنے میں ہی اپنی عافیت جان لی۔

کافی رات گئے تک اڑوس پڑوس کی عورتیں ڈھولک کی تھاپ پر خوشی کے گیت گاتی رہیں۔ ایسا جان پڑتا تھا کہ عابدہ کو قارون کا خزانہ ہاتھ لگا ہے۔ بھرپور انداز میں مسرت وشادمانی کا اظہار کیا جارہا تھا۔ راکب اِن لوازمات سے دامن بچائے چھوٹے ڈالان کے گوشہ راست میں بیٹھے اپنے آنے والے کل کی بابت سوچ رہا تھا۔ صبح صادق مولوی تمیزالدین بچے کا نام رکھنے والی رسم میں شرکت کرنے بُلائے گئے۔ اور بچے کا نام آفتاب احمد رکھا گیا۔

آفتاب کی پرورش خوب ناز کے ساتھ کی گئی۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ماں باپ کا پیار آفتاب کے لئے بڑھتا گیا اور خلافِ توقع راکب کے ساتھ ناروا سلوک اپنایا جانے لگا۔

صدائے احتجاج بُلند کرنے یا واویلا سے کام لینے کے بجائے راکب نے چُپ سادھے حالات کا جائزہ لینا ہی مناسب جان لیا۔ خاموش رہ کر وہ اپنے آپ کو سمجھانے لگا

کہ "آفتاب چاچا چاچی کا اپنا خون ہے اس لئے اُس کے ساتھ اُن کا محبت جتانا ایک قدرتی امر ٹھہرا۔ میں آخر کار پرایا ہوں"۔ اب تو اس گھر میں توجہ کا مرکز فقط اور فقط آفتاب تھا۔ راکب کے ساتھ کھُلے دل سے تبادلہ خیال کرنا تو دُور اُس کی خیر و خبر لینے کی بھی کسی کو فرصت نہ تھی۔

اِدھر راکب ایک ایک قدم پھُونک پھُونک کر اُٹھانے لگا اور اُدھر چاچی عہد کر بیٹھی تھی کہ راکب اور اُس کے چاچے کے درمیان نفرت و کدورت کی دیوار کھڑی کر دی جائے۔ اب تو معمول بن چکا تھا کہ رشید میاں گھر میں قدم رکھتے تو راکب کی نسبت نہ جانے کیا کچھ سُننا پڑتا تھا۔ پہلے پہل رشید نے عابدہ کی باتوں پر کان نہیں دھرا مگر لحظہ بہ لحظہ اُس کے دل میں راکب کی بابت بدگمانی نے گھر کر ہی لیا۔

آج جب رشید میاں کچھ دِنوں کی غیر حاضری کے بعد گھر لوٹے تو عابدہ نے حسب عادت ترکش سے ایک اور تیر پھینکا۔

"اب اس گھر میں راکب رہے گا یا میں"

"ایسی کون سے بات ہو گئی عابدہ"۔ رشید نے پوچھا

"کیا بتاؤں"۔ عابدہ تاسف بھرے لہجے میں بولیں

"یہ کل ہی کہ بات ہے کہ راکب نے مجھ سے پچاس روپے مانگے۔ میری جیب اُس وقت خالی تھی۔ میں نے انکار کیا تو مُنہ زوری پر اُتر آیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ طرح طرح کہ صلواتیں سُناتے ہوئے مارنے کی دھمکی تک دے گیا۔ گالیاں دیتے ہوئے گھر سے نکلا۔ ابھی تک واپس نہیں آیا۔ سُنا ہے اب سگریٹ بھی پینے لگا ہے۔"

عابدہ راکب کی نسبت شکایات کا پلندہ کھولے رشید کے چہرے کا جائزہ لینے لگی

جو غیض و غضب کے ملے جُلے اثرات سے بھر گیا تھا۔۔۔اسی دوران راکب فلمی گیت گنگناتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

''بھگوان دو گھڑی ذرا اِنسان بن کے دیکھ

دھرتی پہ چار۔۔۔۔۔۔۔۔

''کہاں تھے۔ اِس وقت تک بھگوان کے بچے''

رشید میاں غصے میں اُبل پڑے۔

راکب اس غیر متوقع صورت حال کے پیش نظر سہم سا گیا۔ جیسے اُس پر ہمالیہ پہاڑ ٹوٹ پڑا ہوا۔ اتنا جاننے میں اُسے دیر نہیں لگی کہ چاچی نے حسب سابق کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑا ہے۔ وہ خاموشی سے فرمانبردار طفل کی طرح کھڑا رہا۔

''میں پوچھتا ہوں اس وقت تک تم کہاں تھے''۔

جواب نہ پا کر رشید میاں غصے میں آ کر چلائے۔

''اب تیری یہ ہمت کہ جب میں گھر سے غیر حاضر رہوں تم اُودھم مچادو۔ طوفان بپا کردو۔ کبھی آفتاب کو چھیڑتے ہو تو کبھی چاچی سے جھگڑتے ہو، کمینے! چاچی نے تمہیں ماں کی طرح پالا پوسا۔۔ یہ اُس کا بدلہ دے رہے ہو۔ یہ تمہارے باپ کا گھر ہے جو تم اِسے میدانِ جنگ بنانے کی کوشش میں ہو۔''

راکب اب بھی خاموش رہا۔ اُس کی خاموشی کو اقبالِ جُرم سمجھ کر رشید میاں اور طیش میں آ گئے اور اُس کے مُنہ پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا:

''بے شرم چُپ کیوں ہو۔ کچھ بولتا کیوں نہیں''

اب کی راکب نے بہ مشکل زبان وا کر دی۔

''چاچا جی! یہ سب جھوٹ ہے''

''کمینے تو جو کہے وہ سچ ۔۔اور تمہاری چاچی کہے وہ لغو اور بکواس۔۔۔بے غیرت کہیں کے دُوز ہو جاؤ میری نظروں سے''۔

چاچا کو غصے میں لال پیلا ہوتے دیکھ کر راکب سر جُھکائے اپنے کمرے میں چلا گیا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ بگڑے ماحول میں زیادہ ارتعاش پیدا ہو۔وہ اپنی قسمت کو کوسنے لگا۔افسردہ حالات میں اُس کی توجہ تعلیم سے ہٹنے لگی۔اور جب بی اے کا نتیجہ نکلا تو راکب کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

عابدہ نے اِس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔اور ایک تیر ترکش سے نکالا۔

''اجی ایسے آوارہ صفت لڑکے بھی کہیں پاس ہوتے ہیں جو دن بھر دربدری کرتے ہیں،جُوا کھیلتے ہیں اور شام کو بغل میں کتابیں دبائے گھر آجاتے ہیں''۔

اس بار عابدہ کا تیر خالی نہیں گیا۔رشید بھی عابدہ کی تائید کرتے ہوئے بے رُخی کے ساتھ راکب پر برس پڑا۔

تیرے ماں باپ میرے پاس بھری تجوری نہیں چھوڑ گئے تھے جو تم رقم اُڑاتے پھرو۔ہم نے تمہاری ساری زندگی کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے کہ تمہارے ناز نخرے برداشت کرتے رہیں۔تم اپنی من مانی کرتے رہو۔غور سے سُن لو اِس گھر میں رہنا ہے تو کچھ کما کے لاؤ۔آخر کب تک مُفت کی روٹیاں توڑتا رہے گا۔''

آج تک راکب نے خاموش رہ کر چاچی کے ظلم وستم سہہ لئے تھے مگر اب چاچا کی زبان سے تُرش وکرخت الفاظ سُن کر اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ کمرے میں گھس چارپائی پر اُوندھے مُنہ گر پڑا۔ اپنی بدبختی پر زارزار رونے لگا۔ گھناونے مستقبل کا غم زدہ نقشہ آنکھوں کے سامنے منڈلانے لگا۔

راکب افراتفری کے عالم میں کروٹیں بدلتا رہا۔ اِسی دوران ماں کی یاد ستانے لگی۔ وہ عالم اضطراب میں بڑبڑایا۔

''ماں! کیا تمہیں بھی میری بے کسی پر رحم نہیں آتا مجھے
اپنے پاس بُلا لو ماں۔ اِس دنیا سے اُٹھا لو جہاں قدم قدم
پر مکاری اور دغابازی اپنے ہونے کا اعلان کرتی ہے''

راکب سسکیاں بھر رہا تھا۔ اس کے برعکس رشید میاں اور عابدہ آفتاب کے مستقبل کو درخشاں بنانے کی بابت سوچ رہے تھے۔ بازو والے کمرہ میں آفتاب بے فکری کی نیند سو رہا تھا۔

رات صبح کے اِنتظار میں بوڑھی ہوتی گئی۔

صبح سویرے آفتاب دوڑتا ہوا ماں کے پاس آیا۔ اُس کی جانب کاغذ کا داغدار ٹکڑا بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ لوں ماں بھیا کی چھٹی، یہ بھیا اپنے بستر پر رکھ کر نہ
جانے کہاں چلے گئے ہیں۔

عابدہ نے چھٹی رشید میاں کی جانب بڑھادی اور آفتاب کو خاموش رہنے کا اِشارہ کردیا۔ رشید نے چھٹی پڑھنا شروع کی:

چاچاجی

''مجھ پر یہ اصلیت اب آشکار ہو چکی ہے کہ میرا وجود آپ لوگوں کے لئے بوجھ کا روپ دھار چکا ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ آپ میری وجہ سے خوامخواہ پریشان ہوں۔ میں آپ لوگوں کے لئے مزید بوجھ یا پریشانی کا باعث نہیں بننا چاہتا۔ اِس لئے ہمیشہ کے لئے گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ۔۔۔ کہاں ۔۔۔ یہ نہیں جانتا۔ مجھ سے کوئی گستاخی سرزد ہوئی ہو تو معاف کرنا۔''

آپ کا راکب

''یہ سب تیری وجہ سے ہوا عابدہ'' رشید نے کہا اور عابدہ اپنے کئے پر پچھتانے کے بجائے برجستہ کہہ گئی۔

''جانے والا تو چلا گیا۔ اب بے کار جھگڑنے سے کیا حاصل۔'' اور رشید خیالوں میں کھو گیا۔

راکب دن کے اُجالے اور رات کے اندھیرے کو چیرتا چلا جا رہا تھا۔ ایک نامعلوم منزل کی طرف۔ اُس کی حالت پَر کٹے پرندے سے کسی طور کم نہ تھی۔ اُس کی حسرتوں و اُمنگوں کا خون ہوا تھا۔ اور اِن مُردہ اُمنگوں کی لاش کاندھے پر اُٹھائے شہر شہر گھومتا رہا۔ تھک ہار کر اُس نے بڑی ندی کا رُخ کیا اِس خیال کو دل میں بسائے کہ دریا میں کُود کر زندگی کا خاتمہ کر دے۔ رات گئے اپنے حال میں مست بڑی ندی کے آہنی پُل پر پہنچتے ہی اُس کے کانوں میں آواز پڑی ''ہالٹ''

راکب ایک لمحہ کے لئے رُک گیا۔ دُوسرے لمحے اُس کے قدم اُٹھے تو ''ہالٹ خبردار آگے مت بڑھو'' ۔ کی کرخت آواز سُنائی دی۔ راکب نے اِدھر اُدھر جھانکا۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہ دیا۔ دفعتاً پُل کے وسط میں ایک شور بپا ہوا۔ بندوق کی گولیاں شائیں شائیں کرتی گزرنے لگیں۔ راکب دم بخود رہ گیا۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھا اُس نے آگے بڑھنا چاہا۔ مشکل سے کچھ قدم بڑھا تھا کہ ایک گولی راکب کے بائیں بازو میں لگی اور وہ خوف و ہراس کے مارے وہیں گر پڑا۔ دوسرے دن اخبارات میں یہ خبر کلیدی طور چھپ گئی کہ ''تخریب کار جماعت کی طرف سے بڑی ندی کا پُل اُڑا دینے کی سازش ناکام بنا دی گئی۔ دو سازشی موقع پر مارے گئے اور تین کو زخمی حالت میں گرفتار کر لیا گیا۔ وہ فوجی ہسپتال میں زیرِ علاج ہیں۔''

راکب کو ہوش آیا تو بستر سے اُٹھنے کی کوشش کی دفعتاً نرس چلائی۔

''اُٹھئے مت! آپ کو آرام کی ضرورت ہے''۔

یہ کہتے ہوئے نرس نے راکب کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ راکب نے نازک انگلیوں کا لمس محسوس کیا اور غیر ارادی طور اپنا ہاتھ نرس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے۔'' ۔۔۔ ''گلبدن'' نرس نے کہا۔

گُل بدن دراصل محکمہ سراغ رسانی سے وابستہ تھی اور مقامی ملٹری ہسپتال میں نرس کے طور کام کر رہی تھی۔ راکب کی بابت اصلیت جاننے کی غرض سے وہ راکب کے ساتھ گھل مِل گئی۔ وہ ہدایت کے تحت کام کر رہی تھی۔ ٹمپریچر ریکارڈ کرنے کے بعد ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا۔

''آپ کا نام''

''جی! میرا نام مر چکا ہے''

''نام مر چکا ہے۔کیا معنی۔'' یہ گل بدن تھی۔

''ہاں ہاں میرا نام مر چکا ہے۔ میری حالت ایک زندہ لاش سے کم نہیں۔۔۔ ویسے مجھے راکب کہتے ہیں۔''

''نام اچھا ہے مگر کام تو تباہی و بُر بادی سے لبریز''۔

''کیسی باتیں کرتی ہو گُل بدن''

''آپ رات کے اندھیرے میں پُل اُڑانے کی حرکت کرتے پکڑے گئے۔''

آخر گل بدن نے مطلب کی بات چھیڑ دی۔

''میں پُل اُڑانے میں ملوث''۔ راکب حیرانی کا مجسمہ بن کر کہنے لگا۔

''ہاں آپ بھی دہشت گردوں میں شامل تھے۔ پولیس رپورٹ میں یہی کچھ درج ہے۔ دیش کی بربادی سے آپ لوگوں کو کیا حاصل ہوتا ہے''۔

گل بدن ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔

''لیکن یقین کرلو! میں پُل اُڑانے نہیں گیا تھا۔ سچ تو یہ ہے گل بدن کہ میں اپنی زندگی کا پُل اُڑانے گیا تھا۔''

''زندگی کا پل۔۔۔ کیا کہنا چاہتے ہو
مجھے نہیں سناؤ گے اپنی کہانی'' گل بدن اصلیت جاننے کی چاہ میں کہہ گئی۔

''بلاوجہ گذرے دِنوں کی یاد تازہ ہو جائے گی۔

چھوڑو اِن گذری باتوں کو جن میں درد و کوفت کے سِوا کچھ نہیں"

بدلے میں گُل بدن نے اپنائیت کے انداز میں اصرار کیا کہ راکب انکار نہ کر سکا۔

راکب اپنی کتاب زیست کا ایک ایک ورق اُلٹتا گیا اور گل بدن سنتے سنتے اچانک چیخ پڑی۔

"بس کرو راکب، بہت دُکھ اُٹھائے ہیں تم نے مجھ سے سُنا نہیں جاتا۔"

راکب خاموش ہو گیا۔ اور کچھ توقف کے بعد گُل بدن بول اُٹھی

"لیکن اِس کا مطلب یہ تو نہیں کہ پریشانیوں سے تنگ
آ کر خودکشی کی بابت سوچا جائے۔ پریشانیوں سے تنگ
آ کر فرار کا راستہ اختیار کرنا تو بزدلوں کا کام ہے"۔

جواب میں دونوں ایک دوسرے کو اُلفت بھری نظروں سے گھورنے لگے۔

راکب کی تیمارداری میں گل بدن نے دن رات ایک کئے۔ اُن کی بے لوث ہمدردی نے راکب کو سرعت کے ساتھ تندرست کر دیا۔ گل بدن کی رپورٹ پر دیگر دو پکڑے گئے افراد کے بیانات کے بموجب راکب کی بابت اصلیت جان کے پولیس نے اُسے بری کر دیا۔ لیکن گل بدن کے چنگل سے اُسے آزادی نہ مل سکی۔ ہسپتال سے چُھٹی لیکر وہ راکب کو اپنے سرکاری کوارٹر میں لے آئی۔ جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ راکب گذشتہ واقعات سے قطع تعلق محبت کی چھوٹی سی دنیا آباد کرنے کی بابت سوچنے لگا۔

ماں کی رضامندی حاصل کئے گل بدن اور راکب شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ اور خوشی خوشی زندگی گزارنے کے سپنے دیکھنے لگے۔۔۔ گُل بدن کی کوششوں کی

بدولت راکب دو سالہ تربیتی کورس مکمل کر کے اسٹیٹ ہسپتال میں ملازمت کرنے لگا۔ راکب کی دنیا ہی بدل کر رہ گئی۔ ٹھیک کہا ہے داناؤں نے کہ ڈراونی اندھیری رات کے بعد فرحت بخش سویرا نمودار ہو ہی جاتا ہے۔

وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔ گُل بدن اور راکب کی پھلواری میں دو کلیوں کا اضافہ ہوا۔ راکب کو شریک حیات، ماں اور دو بچیوں کی رفاقت کیا حاصل ہوئی مانو دنیا بھر کی خوشیاں ہاتھ آگئیں۔

ایک شام ڈیوٹی سے فارغ ہو کر راکب بلڈ بینک سے وابستہ کمرہ بند کر رہا تھا کہ مانوس آواز نے کانوں کے پردے ہلا دئے

''مجھ دُکھیاری پر رحم کھاؤ بابو۔ اگر خون دستیاب نہ ہوا تو میرا بیٹا سدا کے لئے مجھے چھوڑ کر جائے گا۔ کسی نہ کسی طرح خون فراہم کر دیجئے۔''

''چاچی'' راکب سے نہ رہا گیا۔ اُس نے اپنے ساتھی توفیق سے ہمکلام اپنی چاچی کو پہچان لیا تھا۔

عابدہ نے اپنی کمزور آنکھوں کو اوپر اُٹھایا اور راکب سے لپٹ کر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

''بیٹا! تمہارا بھائی آفتاب مرنے کو ہے اُسے خون کی ضرورت ہے مجھ نصیبوں جلی پر رحم کھاؤ''۔

راکب نے چاچی کے ہاتھ سے ٹکٹ لے لی۔ اوہ آفتاب کا اکسیڈنٹ ہوا ہے، خون کا گروپ دیکھ کر اُسے مایوسی ہوئی کیونکہ اِس گروپ کا خون سردست دیستاب نہ تھا۔

راکب نے چاچی کو آفتاب کے بیڈ کے پاس بٹھایا اور خود ڈاکٹر رمضان کے پاس چلا گیا۔ اپنے خون کا ٹیسٹ کرایا۔ اطمینان کا سانس لیا جب گروپ مل گیا۔

اپنی رگوں میں سے خون نچوڑ کر آفتاب کی نیم جان نسوں کی نذر کرا دیا۔ راکب آج کتنا خوش تھا کہ کم از کم پروردگار نے اُسے احسانوں کا بدلہ چکانے کا موقع بخشا۔

راکب کی قربانی رنگ لائی اور اُس کے خون کی بدولت آفتاب کی جان بچ گئی۔ راکب نے گل بدن کی شرکت میں آفتاب کی تیمار داری دل و جان سے کی۔ اور وہ وقت بھی آیا جب آفتاب تندرست ہو کے ہسپتال چھوڑتے وقت اپنے بھائی کے پاؤں پر ڈھیر ہوا اور بچوں کی طرح رونے لگا۔

''بھیا! ہمیں معاف کردو! ہم نے آپ کو ہر قدم پر دُکھ سے نوازا۔ آپ کو گھر سے بے گھر کر دیا۔ اور اِس کا معاوضہ آپ نے کس اپنائیت سے چُکایا۔ ہمیں معاف کرنا بھیا''۔

''ارے پگلے میں نے تو اپنا فرض ادا کیا''۔ راکب برجستہ کہہ گیا اور آفتاب کو قدموں سے اُٹھا کے گلے سے لگا لیا۔ دونوں بھائی فرطِ مسرت میں رونے لگے۔ عابدہ سامنے کھڑی تھی۔

اپنے کیے پر نادم و شرم سار۔۔۔!

اُس نے راکب کو اپنایت بھرے انداز میں گلے لگا لیا۔ اور گلوگیر آواز میں گویا ہوئی۔

”بیٹے راکب ہو سکے تو مجھ گناہ گار کو معاف کر دینا۔ ویسے
تم معاف بھی کر دو۔ پھر بھی میں جانتی ہوں کہ اللہ پاک
مجھے معاف نہیں کرینگے۔ میں نے تم پر کتنے ظُلم ڈھائے
بیٹے! تمہارے ساتھ ساتھ مجھ چڑیل صفت نے تمہارے
چاچا اور اپنے رفیق زندگی پر بھی جفا کی۔۔۔ میری تنگ
دلی، اور کوتاہ نظری سے تنگ آ کر وہ اِس دنیا سے سدا کے
لئے منہ موڑ کر چلے گئے۔ کاش مجھے موت آجاتی۔
کاش۔۔۔“

چاچی! دل چھوٹا نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔
قسمت کے لِکھے کو کون مِٹا سکتا ہے۔

راکب کے بجائے گل بدن نے عابدہ کو تسلی دی اور پھر سب کے سب ہسپتال سے نکل کر ایک نئی مگر خوشگوار منزل کی جانب چل پڑے۔۔۔ نئی منزل۔۔۔ اپنائیت و اُنسیت سے لبریز منزل۔۔۔۔



امانت

تنویر اور اُس کی چھوٹی بہن ساجدہ شہر کے ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے والد الطاف نواز اِسی سال چیف انجینئر کے ممتاز عہدے سے سبکدوش ہو چکے تھے اور ماں مقامی گرلز ہائی اسکول میں بحیثیت ہیڈ ٹیچر فرائض انجام دے رہی تھی۔ الطاف نواز کی دِلی خواہش تھی کہ تنویر بھی انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کرلے لیکن تنویر کو اِس شعبے سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ بلکہ وہ پڑھ لکھ کر ماں کی طرح ایک معلم بننا چاہتا تھا۔ ادب اور ثقافت کی جانب اُس کا رجحان زیادہ تھا۔ الغرض والد کی آرزو کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے تنویر ادبی سرگرمیوں میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ شعر و شاعری سے بھی لگاؤ بڑھنے لگا۔

شہر کے وسط میں جہلم کے کنارے الطاف نواز کا تین منزلہ شاندار بنگلہ تھا۔ زیرین منزل میں مہمان خانہ، بڑا ہال، اسٹور روم اور رسوئی گھر کے علاوہ تنویر و ساجدہ کے کمرے بھی تھے۔ پہلی منزل میں والدین اور دیرینہ نوکر رحیم چاچا قیام پذیر تھے۔ رحیم چاچا بچپن سے اس گھر سے وابستہ تھا اور اس کبرسنی میں وہ تنویر کے والدین کا چھوٹا موٹا کام کیا کرتا تھا۔ ساجدہ رسوئی گھر میں ماں کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ البتہ کالج میں داخلہ لینے کے بعد اُسے زیادہ وقت پڑھائی میں صرف کرنا پڑتا۔ اِدھر کچھ مہینوں سے بیگم الطاف کے گھٹنوں میں درد رہنے لگا تھا۔ اُس نے چاہا کہ تنویر کے ازدواج کا بندوبست کیا جائے تاکہ بہو گھر میں آئے اور اُس کا ہاتھ بٹائے۔ اِسی دوران الطاف نواز کے یارِ غار ابراہیم خواجہ ڈوڈہ سے تشریف لائے اور اُن کے ہاں کچھ روز ٹھہرے۔ دراصل الطاف نواز اور

ابرہیم خواجہ نے اِکھٹے بنگلور سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کرلی تھی۔ باتوں باتوں میں ابراہیم خواجہ نے اپنی بیٹی آرفین کا قصہ چھیڑا جو ایجوکیشن میں ایم اے کررہی تھی۔ الطاف نواز بھی چاہتے تھے کہ برسوں کی دوستی رشتہ داری میں بدل جائے۔۔۔لیکن تنویر کو شادی سے جیسے خدا لگتا بیر تھا۔ اُس نے جم کر مخالفانہ رویہ اپنا کرسب کو مایوس کردیا۔ الطاف نواز پہلے ہی ناراض کہ انجینئرنگ نہ پڑھ کے زبان وادب کا متوالا بنا اور اب اُس کے جگری دوست کی بیٹی کا رشتہ نامنظور کر کے اُسے رنجیدہ کردیا۔ تنویر اپنے والدین کا سامنا کرنے سے بھی کتراتا تھا۔

''بھیا شادی کے لئے ہاں کردو۔۔۔ پاپا اُمی کی خواہش کا احترام کیے اُن کی خوشنودی حاصل ہوگی۔ آج نہیں تو کل شادی کرنی ہی پڑے گی۔ پھر یہ ہٹ دھرمی کس لئے''۔

یہ بات ساجدہ نے اپنایت بھرے لہجے میں کہہ دی۔

''بہن! شادی کے بعد ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنا سارا دھیان پڑھائی کی طرف دوں میں ایک معتبر ادیب بننا چاہتا ہوں۔۔۔ایک کہانی کار کے طور اپنی شناخت چاہتا ہوں۔ ابھی شادی کی بابت سوچنا بھی عبث ٹھہرا''۔

اِسی دوران بنگلہ کے صدر دروازہ پر دستک ہوئی۔

تنویر نے دروازہ کھولا۔ نظر اُٹھائی تو ایک جوان لڑکی سامنے کھڑی تھی۔ صورت

وشکل سے پنجابن لگتی تھی۔ گندی سی شلوار، میلا سا کرتہ سر پر چادر بھی کوئی صاف نہیں تھی۔ اُس کا حُسن مصیبتوں کے گرد و غبار سے مدہم پڑ چکا تھا۔ جیسے چاند بادل کی آڑ میں چھپ جائے۔ لڑکی نے نہایت ادب سے سلام بجالایا۔

تنویر نے ساجدہ کی طرف اِشارہ کیا

ساجدہ نے اُسے اپنے قریب بُلایا اور پوچھا

''کیا چاہتی ہیں آپ؟''

''کوئی کام''

''کیسا کام''

''گھر میں کوئی کام ہو۔ کھانا بنانے کا،

جھاڑو لگانے کا۔ حضور کے بچوں کی

نگہداشت کا اور جو بھی کام ہو''

''پر ابھی تو ہماری شادی بھی نہیں ہوئی، مُسکرا کر ساجدہ نے کہا

''خدا کو منظور ہوا ہو جائیگی۔ تب تک میں آپ

لوگوں کی خدمت بجالاؤں گی۔ اور سرکار کی بھی''

اتنا کہہ کے تنویر کی جانب اِشارہ کیا۔

''یہ کون ہیں؟'' ساجدہ نے پوچھا

''حضور کے سرکار''

''نہیں یہ میرے بڑے بھائی تنویر احمد ہیں''

''معاف کرنا میں کچھ اور ہی سمجھی تھی''

تمہارا نام کیا ہے'' ساجدہ کی رگ تجسس جاگ اُٹھی۔

''میرا نام مہرو ہے''

''کہاں رہتی ہو''؟

گاؤں کی ہوں، بُوڑھے والد کے ساتھ رہتی ہوں''

''کچھ پڑھی لکھی ہو''۔اب تنویر نے پوچھا

''تھوڑا سا''

الغرض والدین ور حیم چاچا کی رضامندی حاصل کیئے مہرو کو گھریلو کام کاج کے لئے رکھا گیا۔اسٹور روم کے مُلحق اُسے کمرہ ملا۔ساجدہ نے اپنے پرانے مگر صاف ستھرے اور دھلے کپڑے مہرو کو پہننے کے لئے دئے۔وہ جب صاف ستھری ہو کر صبح سویرے تنویر کے کمرے کو صاف کرنے گئی اُس نے دروازہ کی دراز سے جھانک کر کمرے کا جائزہ لیا۔ تنویر ابھی سُو رہا تھا۔وہ دروازہ کے پاس خاموش کھڑی رہی۔پھر آہستہ سے کمرہ کا دروازہ کھولا اور جھاڑُو لگانے لگی۔جھاڑُو کی آواز سے تنویر کی آنکھ کُھل گئی۔اُس نے آہستہ سے پوچھا۔

''ساجدہ کیا ہے'' اور اُسے جواب ملا

''سرکار ساجدہ نہیں۔آپ کی نوکرانی ہے''

تنویر نے آنکھیں کھولیں، ایک خوبصورت سی شرمیلی لڑکی نگاہیں نیچی کئے ہوئے کھڑی تھی۔

تنویر نے بھرپور نظر اُس کے چہرے پر ڈالی اور دیکھتا رہ گیا۔

''سرکار آپ آرام کیجئے! میں آہستہ آہستہ کمرہ صاف کرلوں گی''

اور پھر اُس نے کمرہ صاف کر دیا۔۔۔ میز کی چادر اُٹھا کر جھاڑ دی۔ اور شلف پر کتابیں قرینے سے لگا دیں۔ پھر اُس کا آئینہ اپنے پلو سے صاف کیا۔ چھوٹی میز تنویر کے پلنگ کے پاس لگا دی اُس پر شیونگ سامان جما دیا۔

''میں پندرہ منٹ میں چائے لاؤں گی''

یہ کہہ کر مہرو مہمان خانہ کی صفائی کرنے لگی۔ میز کُرسیاں اور صوفہ سیٹ وغیرہ از سر نو طریقے سے جما دیں۔

کمرے اور ہال کی آرائش دیکھ کر تنویر کا سر چکرانے لگا۔

''مہرو! میں تو تمہاری سلیقہ مندی اور صفائی دیکھ کر دنگ ہوں''.

''کیا آپ میرے کام سے خوش ہیں؟''

''ہاں مہرو''

''یہ میری خوش قسمتی ہے، کوشش کروں گی کہ بڑے صاحب اور ساجدہ جی کو بھی میرا کام پسند آئے''۔

اتنے میں ساجدہ کمرے میں آ گئی۔ وہ بھی صفائی اور طریقے سے رکھی گئی چیزیں دیکھ کر واقعی خوش تھی۔

مہرو چائے لیکر آئی اور ٹی پائی پر رکھ کر چلی گئی۔

''ساجدہ! کیا مہرو ہمارے ساتھ چائے نہیں پی سکتی''

''کیوں نہیں وہ تو سلیقہ شعار لڑکی ہے۔ البتہ ماں اور پاپا کو یہ سب پسند نہیں آئے گا۔ ہم لوگوں کو البتہ کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے''۔

دونوں نے چائے نہیں پی۔ وہ مہرو کا انتظار کرنے لگے۔ مہرو آئی تو اُس نے دیکھا چائے ویسے ہی رکھی ہے۔

ساجدہ نے کہا

''مہرو ہمارے یہاں کا قاعدہ ہے کہ چائے نوکر خود تیار کرتا ہے''

مہرو نے چائے بنائی، پیالے دو ہی تھے۔

''ایک پیالہ اور لے آؤ'' ساجدہ نے کہا

مہرو دوڑتی گئی اور ایک پیالہ لے آئی۔ اُس میں بھی ساجدہ نے چائے انڈیل دی اور مہرو سے کہا

''اس کرسی پر بیٹھو مہرو'' وہ کھڑی ہی رہی۔

ساجدہ نے تب تنویر سے انگریزی میں کہا کہ آپ ہی اِسے سمجھا دیں۔

''مہرو! ساجدہ بہن چاہتی ہے کہ تم بھی ہمارے ساتھ چائے پیو، وہ تمہارے کام سے بہت خوش ہے۔ تم قریب قریب اُن کی عمر کی ہو۔ اُن کی سہیلی کی طرح اس لئے وہ تمہیں نوکر نہ سمجھ کر سہیلی کا درجہ دینا چاہتی ہے۔ ٹھیک ہے نا''۔

ساجدہ نے دیکھا کہ یہ سُنتے ہی مہرو کی آنکھوں میں آنسو کے قطرے تیرنے لگے۔ اُس سے ضبط نہ ہوسکا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوگئی اور مہرو کو اپنے سینے سے لگالیا۔۔۔

''مہرو تم سہیلی نہیں بلکہ میری بہن ہو۔ ماں پاپا الگ خیالات کے لوگ ہیں۔ اُن کی نسبت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ پر ہمارے لئے تم نوکر نہیں ہو۔ تم ہمارے ساتھ بیٹھ کر

چائے پیوگی۔اور کھانا بھی ساتھ ہی کھاؤ گی۔" ساجدہ کا لہجہ اپنائیت سے لبریز تھا۔

"بہن جی! خاک کا ذرہ ہوا کے جھونکے سے اُوپر اُڑ کر
چاہئے جتنی بلندی پر پہنچ جائے پر ہوا کا زور کم ہونے پر وہ
نیچے کی طرف ہی گرے گا اور گر کر خاک میں مِل جائے
گا۔مہرو آپ کا درجہ اختیار نہیں کر سکتی"۔

بدلے میں ساجدہ نے اُس کے دائیں گال میں ایک ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا:

"چل چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ بڑی پڑھی لکھی بن رہی
ہے۔چائے پی لے ابھی پاپا کام کے لئے بلائینگے۔"

"اُن کو اور رحیم چاچا کو میں نے چائے دی ہے" یہ مہرو تھی، مہرو نے چپکے سے چائے پی اور پھر چائے کے برتن اُٹھا کر لے گئی۔ تب تنویر نے زبان وا کر دی۔

"مہرو نے کِس قدر وزنی بات کہی ہے۔تم نے سمجھا کچھ! ایک فلسفی کی طرح بات کرتی ہے۔"

"یہ تو انفریارٹی کمپلیکس ہے" ساجدہ نے لقمہ دیا

"میرا خیال ہے کہ وہ بہت مصیبت زدہ ہے۔ کیونکہ میں
نے دیکھا کہ اُس کی آنکھوں میں ہر وقت آنسو رہتے
ہیں۔ ہم لوگوں کو کوشش کرنی چاہئے کہ اُس کے دل سے
یہ احساس کمتری کسی طرح سے نکل جائے۔" یہ تنویر تھا۔

"میں اس معاملے میں ہر امکانی مدد کرنے کی کوشش

کروں گی۔مگر پس پردہ! کیونکہ پاپا اور ممی تو اِسے نوکر ہی
خیال کرتے ہیں"۔

کچھ ہفتے ہی گذرے تھے کہ ساجدہ کو یہ احساس ہونے لگا کہ مہرو ایک خاندانی فرد کی طرح گھر کے معاملات میں دل چسپی دکھانے لگی ہے اور یہ بھی خوش آئیند بات کہ تنویر کے خیالات میں عورت ذات کی بابت تُرش روی میں بڑا فرق پڑا۔ساجدہ دل ہی دل میں مہرو کو دعائیں دینے لگیں کہ اُس کی سلیقہ شعاری اور ادب نوازی نے اُس کے بھائی میں ایک خوش گوار تبدیلی لائی۔

صبح جب مہرو چائے بنانے لگی تو پاپا نے آواز دی وہ دوڑی گئی۔۔۔۔دراصل وہ پاپا کی میز پر تازہ پھولوں کا گلدستہ رکھنا بھول گئی تھی۔ پاپا اُسے ڈانٹ رہے تھے۔اور وہ سسک سسک کر رُو رہی تھی۔

"حضور کل سے میں تازہ پھولوں کا گلدستہ رکھ دیا کروں
گی۔آج پھول کم تھے اس لئے چھوٹے سرکار کے کمرہ ہی
کا گلدستہ سج سکا"۔

"چھوٹے سرکار کون؟"

تنویر صاحب"

"وہاں گلدستہ رکھنے کو کس نے کہا" پاپا گرج کر بولے،تنویر اور ساجدہ سب کچھ سُن رہے تھے۔ساجدہ دوڑی ہوئی گئی اور کہنے لگی۔

"پاپا میں نے ہی کہا تھا بھیا کے کمرہ میں گلدستہ رکھنے کے
لئے۔آپ کے لئے ہم تازہ پھولوں کا گلدستہ ابھی

منگوا دیتے ہیں"

تب ساجدہ کے پیچھے پیچھے مہرو بھی نیچے آگئی۔

مہرو نے دیکھا کہ چائے ویسی کی ویسی رکھی ہے۔ تب اُس نے کہا

"آپ نے چائے ابھی نہیں پی"

"تمہارا انتظار تھا مہرو" یہ تنویر تھا

اُس پر مہرو نے نہایت حلیمی سے کہا:

"حضور نے اگر دیکھ لیا تو میں نکال دی جاؤں گی۔ جو آپ لوگوں نے میرے لئے رزِق کا دروازہ کھولا ہے وہ بھی بند ہو جائے گا۔۔۔ آپ پی لیں۔ میں بھی بعد میں پی لُوں گی۔"

شام کو تنویر اور ساجدہ کار میں بازار گئے

واپسی پر تنویر نے مہرو کو ایک پاکٹ تھما دیا

"یہ تمہارے لئے مہرو"

کمرے میں جا کر اُس نے پاکٹ کھولا اُس میں ایک ریشمی شلوار و کرُتے کا کپڑا تھا۔ ایک گلابی رنگ کا ڈوپٹہ تھا۔

"رحیم چاچا کی وساطت سِلوا دینا مہرو" تنویر بُولے

"شکریہ! پر ایسے کپڑے نوکروں کو زیب نہیں دیتے۔ کیسے پہن سکوں گی اِنہیں میں" یہ کہہ کر تنویر کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ تنویر کی آنکھوں میں عاجزی تھی۔

اِتنے میں ساجدہ کمرے میں آئی۔

"مہرو بہن کپڑے ٹھیک ہیں نا"

''بہن جی آپ کی پسند لاجواب ہے۔ پر آپ ذرہ کو

آفتاب بنا رہی ہیں۔ کھدر پر ریشم کا بیل بوٹا لگانے سے

کھدر ریشم نہیں ہوسکتا''۔ اور مہرو رُونے لگی۔ ساجدہ نے

اپنے ڈوپٹے سے اُس کے آنسو پونچھے۔ تب اُسے محسوس

ہوا کہ مہرو کو بخار ہے۔ اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

پیشانی اُس کی جل رہی تھی۔

''مہرو تمہیں تو بُخار ہے تم کمرے میں آرام کرو'' ساجدہ نے کہا

''آپ کو کھانا کھلائے بغیر میں کیسے آرام کروں''

اور وہ دوڑی ہوئی کھانا لینے چلی گئی۔ ساجدہ نے اُسے بھی کھانا کھانے کے لئے

کہا۔ تب تنویر بولے

''اِس کے لئے دودھ اور ڈبل روٹی ٹھیک رہے گی۔

میں ڈاکٹر آفاق سے دوائی بھی لاتا ہوں''

یہ کہہ کر تنویر باہر چلے گئے۔ اور ساجدہ نے مہرو کو زبردستی اُس کے کمرے میں لیکر

آرام کرنے کی تلقین کی۔

دودھ کے ساتھ دوائی پلا کر ساجدہ اپنے کمرے میں جا کر سُو گئی۔ البتہ تنویر اپنی

ادھوری کہانی ''امانت'' کو مکمل کرنے لگا۔ تنویر سوچوں کی نگری میں محو تھا کہ مہرو کی کراہنے

کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

تنویر مہرو کے قریب گیا۔ اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ماتھا تپ رہا تھا۔ ٹمپریچر

ریکارڈ کر کے دوائی دی۔ اور پھر پاس ہی پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تذبذب کے عالم

میں پڑا رہا اور پھر آنکھ لگ گئی۔

صبح سویرے خلاف معمول الطاف صاحب جاگے۔ اور مہرو کو آواز دی۔ رحیم چاچا مسجد گئے تھے۔ اور جواب نہ پا کر الطاف صاحب نے مہرو کے کمرے کا رُخ کیا۔ دروازہ اُدھ کھلا تھا۔ دراز میں سے جھانک کر دیکھا تو تن من میں آگ سی لگ گئی۔ مہرو بستر پر بے سُدھ پڑی تھی اور آرام کرسی پر دراز تنویر مزے کی نیند سو رہا تھا۔ ''صاحبزادے کی یہ مجال کہ ایک نوکرانی کے کمرے میں رات بھر پڑا رہا، بے غیرت کہیں گا۔''

الطاف صاحب بڑبڑا کر اپنے کمرے میں گئے۔ رحیم چاچا نے اُن کو بتا دیا کہ مہرو کی طبیعت ٹھیک نہیں! اُسے بخار تھا۔ پر الطاف صاحب کا غصہ ٹھنڈا نہیں پڑا۔

اور تنویر و ساجدہ کے یونیورسٹی و کالج جانے کے بعد مہرو کو بُلا کے خوب ڈانٹ پلائی۔

''آخر تمہاری وقعت ہی کیا ہے۔ ایک نوکرانی ہو اور اِس
گھر کی بہو بننے کے سپنے دیکھتی ہو۔ اپنی اوقات دیکھو۔
قلاش کی اولاد دُور ہو جاؤ میری نظروں سے''۔

شام کو اُردو اکیڈیمی کی غیر معمولی بیٹھک میں شرکت کرنے کے بعد تنویر واپس آئے تو برآمدے میں رحیم چاچا کو مغموم پایا۔

''کیوں چاچا مہرو کا کیا حال ہے''

''بیٹا! وہ تو گھر چھوڑ کر چلی گئی''

تنویر کو ایسے لگا جیسے اُس کے وجود کو کسی نے کھولتے پانی میں ڈال دیا ہو۔

عالم اضطراب میں مہرو کے کمرے میں گُھسا تو بہن ساجدہ وہاں مایوسی کی تصویر

بنی بیٹھی تھی۔ چہرہ اُترا ہوا۔

''ساجدہ کیا بات ہے۔ مہرو اِس حالت میں کہاں چلی گئی ہوگی''۔ ساجدہ کی مری مری آواز اُبھری ''بھیا کل رات آپ مہرو کے کمرے میں سو گئے تھے۔ ہمارے گھر سے نکل جانے کے بعد پاپا نے مہرو کو خوب ڈانٹا ہے۔ کتنے ظالم ہیں پاپا، میں اُن کی یہ زیادتی برداشت نہیں کر سکتی۔ آخر مہرو بے چاری کا اس میں کیا قصور تھا۔ بھیا وہ نہایت ہی شریف لڑکی ہے۔ اور بے آسرا۔ تیز بخار میں وہ نہ جانے کہاں گئی ہوگی۔ بھیا اُسے ڈھونڈ کر لاؤ۔ ورنہ جانے کیا کچھ اُس کے ساتھ ہوگا۔ میری خاطر اُسے واپس لے آؤ''

تنویر نے بے بسی کی حالت میں کار نکالی۔ تھک ہار کر رات دیر گئے واپس خالی ہاتھ آ گیا۔ بِنا کچھ کھائے پیئے وہ سو گیا۔

ماں، ساجدہ اور رحیم چاچا نے تنویر کو منانے کی کوشش کی لیکن بے سُود! تنویر کی حالت ہی ابتر تھی اور چہرے پر مایوسی واُداسی کے نقوش صاف نظر آ رہے تھے۔

اِدھر سے مہرو بُخار کی حالت میں کوٹھی سے نکلی تھی اور بُخار کی شدت سے وہ چکرا کر سڑک کنارے گر گئی۔ کچھ لوگوں نے اُسے اُٹھا لیا اور پاس والے ڈاکٹر آفاق کے کلینک میں لے گئے۔ ڈاکٹر آفاق نے انجکشن دیا اور کچھ دیر بعد مہرو کو ہوش آیا۔ ڈاکٹر آفاق تنویر کے اچھے دوست تھے۔ بلکہ گریجویشن تک اُنہوں نے ایک ساتھ پڑھا تھا۔ ڈاکٹر نے چاہا کہ تنویر کو فون کر کے بُلائے لیکن مہرو نے منع کیا۔ اُس نے ڈاکٹر آفاق کو

حقیقت حال سے باخبر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے والدین کو بھی فون کر کے بُلایا۔ ڈاکٹر کو تاکید کی کہ تنویر کو اصلیت نہ بتائے۔ مہر و کو بہن کا درجہ بخشتے ڈاکٹر آفاق نے اپنے گھر میں رکھا۔ تنویر کی طبیعت خراب چل رہی تھی۔ ڈاکٹر آفاق دیکھنے آئے تو بولے۔

"ارے یہ کیا حالت بنائی ہے اپنی"

ارے پہلے تو شادی سے اِنکار کرتا رہا اور اب ایک نوکرانی

کو دِل دے بیٹھا۔ واہ رے صاحبزادے کا عشق"

جواب میں الطاف نواز کی نفرت آمیز آواز گونجی۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ علاج کیجئے۔ پاپا کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔"

یہ ساجدہ تھی۔

ملاحظہ کرنے کے بعد ڈاکٹر آفاق نے جتادیا کہ "تنویر کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ میں دوائی لکھ دیتا ہوں البتہ اس کی لگاتار دیکھ بھال کے لئے ایک نرس کی ضرورت ہے۔"

"آپ ہی کسی نرس کا انتظام کریں" تنویر کی ماں بولی

"ٹھیک ہے میں کل شام نرس لیکر آؤں گا۔ اُس کے لئے الگ کمرے کا اہتمام کرنا پڑے گا"

ڈاکٹر چلا گیا، اور پھر تنویر کی حالت بھانپے رفیق حیات سے اُس کی ماں کہہ گئی۔

"خدائے برحق نے ہمیں اِتنا کچھ دے رکھا ہے اور ایک ہی بیٹا۔

اگر تنویر مہرو کو چاہتا ہے تو شادی رچانے میں کیا حرج ہے۔ بیٹے کی

خوشی کی خاطر لوگ سُولی چڑھ جاتے ہیں۔"

اس بار الطاف نواز نے خاموشی اختیار کر لی۔ تنویر کے پژمُردہ چہرے نے اُس

کے غصے وعتاب کو کافور بنایا تھا۔ اگلے روز مہرو کے والدین ڈوڈہ سے تشریف لائے۔ اور دل کے ہاتھوں مجبور ہر کر مہرو نے ڈاکٹر آفاق کی وساطت ساجدہ سے مُلاقات کر کے اصلیت بتا دی۔ اور تاکید کی کہ قبل از وقت حقیقت کا آشکار نہ کرے۔

اگلی شام بُرقعہ میں ملبوس خاتون کو لیکر ڈاکٹر آفاق تنویر کو دیکھنے گئے۔

''دراصل نرس اکیلے میں تنویر سے بات کرنا چاہتی ہے۔

آپ لوگوں کو کوئی اعتراض''

سب لوگ کمرے سے نکل گئے۔ نرس نے برقع کا اگلا پٹ اُلٹ دیا۔ اور جا کے تنویر کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

''مہرو تم''

''جی چھوٹے سرکار''

''لیکن پاپا اُمی کہاں گئے اتنے میں ساجدہ کمرے میں داخل ہوگئی۔

''بھیا گھبراؤ مت۔ دراصل عارفین عُرف مہرو پاپا کے جگری دوست ابراہیم خواجہ کی بیٹی ہے۔ یہ پہلے رشتہ لیکر آئے تھے اور آپ نے تب پاپا کی خواہش کا احترام نہ کرتے ہوئے شادی سے اِنکار کیا تھا''۔

اِسی دوران تنویر کے والدین کے ساتھ ساتھ عارفین کے والدین بھی ایک نرالی شان کے ساتھ کمرے میں گھس گئے۔ الطاف نواز نے سب سے پہلے اپنی ہونے والی بہو کو گلے لگایا اور نہایت ہی مُشفقانہ انداز میں زبان وا کی۔

''بیٹی مجھے معاف کرنا، میں تمہارا گناہ گار ہوں میں نے تم پر اِتنے ظلم ڈھائے

کہ اب میں معافی مانگنے کے لائق بھی نہیں۔۔۔میں

"نہیں ابا جی! مجھے آپ سے کوئی گلہ یا شکوہ نہیں! میں تو خود تذبذب میں پڑی تھی کہ اصلیت کا اظہار کیسے کروں۔ یہ خدائے برحق کا کرم ہے۔ اُس نے موقع بخشا۔۔ اگر آپ مجھے نہ ڈانٹتے تو ڈاکٹر آفاق سے سامنا کیسے ہوتا۔"

"نہیں بیٹا میرا ضمیر مجھے سدا ملامت کرے گا۔ میں نے خوامخواہ تمہیں نہ جانے کیا کچھ بُرا بھلا کہا اور تم فرمانبردار بیٹی کی طرح برداشت کرتی رہی۔ میں اپنے آپ کو معاف نہ کر پاؤں گا"۔

"الطاف! اب یہ فضول کی ڈرامہ بازی ترک کردو! دوستی کو رشتہ داری میں بدلنے کے لئے ضروری ہے کہ برات لیکر ڈاکٹر آفاق کے گھر آجاؤ اور اپنی بہو کو سدا کے لئے نوکرانی کی خلعت بخشو"۔

اس بار ابراہیم خواجہ بات کاٹتے کہہ گئے۔ آن واحد میں کمرے میں زور دار قہقہے بُلند ہو گئے۔

اور دالان میں کھڑا رحیم چاچا دُور خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ اُس پروردِگار کا شکر گذار جس کے رحم و کرم کے صدقے یہ گھرانہ خوشیوں اور مسرتوں کا گھوارہ بنا۔ اور امانت دار کو اس کی امانت مل گئی۔

ہم سفر

ایک غیر سرکاری ادارہ کی سالانہ بیٹھک میں شرکت کرنے علی گڑھ جانا ہوا۔ خیال تھا کہ میٹنگ سے فارغ ہونے پر واپس سرینگر آ جاؤں گا۔ اچانک دہلی میں دورانِ قیام طے پایا کہ جبل پور (مدھیہ پردیش) جا کے اقربا کی صحبت میں کچھ ایام گذاروں۔

نظام الدین اسٹیشن سے مہا کوشل نام سے ریل گاڑی روزانہ جبل پور کے لئے روانہ ہوتی ہے۔ چونکہ پیشگی ٹکٹ حاصل نہیں کی تھی اس لئے مجبوراً جنرل کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ یہ تو خوش قسمتی سے ریلوے مزدور ہوشیار اور پھرتیلا تھا کہ کافی بھیڑ کے باوجود اس نے میرا سامان کسی طرح بغل والی برتھ کے اوپر مخصوص جگہ پر جما دیا۔ میں نے خود دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑا رہنے میں ہی اپنی عافیت جان لی۔

ٹرین وقت پر چل پڑی۔۔۔ میں نے سراسیمگی کی حالت میں ڈبے کا جائزہ لیا۔ سامنے والی سیٹ (برتھ) پر کھڑکی کی جانب خوبصورت جوان لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے بازو میں عمر رسیدہ خاتون بستر بند سے ٹیک لگائے لیٹنے کے انداز میں آنکھیں بند کر کے دراز پڑی تھی۔

''محترمہ اپنا ہولڈال ذرا سرکا دو تا کہ میں بھی بیٹھ سکوں''

میں نے نہایت ہی انکساری کے ساتھ غیر ارادی طور اپنی زبان وا کر دی۔ بدلے میں معمر خاتون نے بند آنکھیں کھول دیں اور نفرت بھری نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

''میری طبیعت خراب چل رہی ہے اس لئے لیٹی ہوں'' اس کے ساتھ ہی اس

نے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے آنکھیں بند کردیں۔ لڑکی معصوم نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی ۔جیسے میری حالت پر رحم آیا ہو۔ بے بسی کے عالم میں ڈبے میں نصب پنکھے کو دیکھنے لگا جو مرے مرے انداز میں چل رہا تھا۔ آگرہ سٹیشن چھوٹتے ہی بڑھیا کو غالباً رفع حاجت کی وجہ سے اُٹھنا پڑا۔ لڑکی اس کے ساتھ جانے سے قبل مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''سامان کا خیال رکھئے گا''

میں نے موقع غنیمت جان لیا۔ کھڑا کھڑا تھک گیا تھا۔ اس کا بستر بند ذرا آگے سرکا کے برتھ کے کنارے بے شرموں کی طرح بیٹھ گیا۔ واپس آنے پر بڑھیا خشم آلود نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔ البتہ لڑکی زیرلب مسکرادی۔

ٹرین پوری رفتار سے چل پڑی۔ اب تو پورے کمپارٹمنٹ میں زیادہ تر لوگ سو گئے تھے۔ کچھ کھڑے کھڑے ہی اونگھ رہے تھے اور کچھ برتھوں کے درمیان والی جگہ دری بچھا کر لیٹ گئے تھے۔ میں نے بیگ میں سے ''خاتون مشرق'' کا خصوصی شمارہ نکالا اور پڑھنے لگا۔ متذکرہ دوشیزہ گاہے گاہے مجھے چور نظروں سے دیکھا کرتی، جیسے کچھ پوچھنا چاہتی ہو، لیکن معمر خاتون کی موجودگی میں چپ سادھے بیٹھی رہی۔

گوالیار پہنچنے پر میرے مقابل والی برتھ خالی ہوگئی۔ برقعہ پوش خاتون غالباً اپنے میاں سمیت اتر گئی۔ میں نے جھٹ بیگ سے چادر نکال کر سیٹ پر بچھادی اور ڈگ بیگ سرہانے میں پھونک بھرنے لگا۔۔۔۔۔ میری اس عجلت پسندانہ حرکت پر لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے نقوش واضح انداز میں اُبھرنے لگے۔ چند منٹوں کے بعد گاڑی چلنے لگی۔

بڑھیا خراٹے بھر رہی تھی

''کون سا رسالہ پڑھ رہے ہیں آپ''۔ دوشیزہ نے خاموشی کے بندھن توڑ ہی

دیے۔

''خاتون مشرق'' ۔۔۔دہلی سے شائع ہوتا ہے۔۔''اس میں۔۔۔۔

''جی ہاں اس میں مفید مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں۔

خواتین کی بابت یہ ماہنامہ کارآمد مواد فراہم کرتا ہے''۔

لڑکی نے بات کاٹتے جواب دیا۔

میں نے موقع کی نزاکت بھانپتے ہوئے رسالہ اس کی جانب بڑھا دیا اور خود اپنے یار غار اور معتبر قلم کار نور شاہ کے افسانوی مجموعہ ''بے ثمر سچ'' کی ورق گردانی کرنے لگا۔

''یہ تصویر آپ کی ہے نا''۔لڑکی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''جی ہاں! کبھی کبھار گردش دوران کے پس منظر میں کاغذ

داغدار کر لیا کرتا ہوں''۔

اس خصوصی شمارے میں میری کہانی ''شیلا'' کے عنوان سے چھپی تھی۔والدین کی دائمی جدائی کے بعد شیلا اپنے چھوٹے بھائی راج کے ساتھ گذر بسر کر رہی تھی۔اچانک شیلا ایک امیرزادہ کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر اسے چاہنے لگی۔گو امیرزادہ گوپال عمر میں شیلا سے کافی بڑا تھا لیکن اس کے عیاشانہ اطوار، عالیشان بنگلہ، کار اور لمبی چوڑی جائیداد نے شیلا کو پوری طور زیر کر دیا۔وہ گوپال کو دل و جان سے چاہنے لگی یہ جانتے ہوئے بھی کہ گوپال نے اپنی بیوی سے ناطہ توڑ دیا ہے اور ایک بچی گوپال کے پاس ہی پرورش پا رہی ہے۔راج نے اپنی بہن میں غیر متوقع تبدیلی بھانپے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔لیکن شیلا نے دھیان نہین دیا۔دراصل اس کے سر پر عیاشی سے زندگی گذارنے کا بھوت سوار ہوا

تھا۔ اب تو اپنے بھائی کا وجود تک اِسے کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ راج اپنی بہن کی بے رخی
بھانپ کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔

"کیا ایک بہن اس قدر سنگدلی کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔ میرا
دل یہ سب ماننے کو تیار نہیں"۔

کہانی پڑھنے کے بعد دوشیزہ نے اپنے تاثرات ظاہر کیئے۔

"ویسے جب تک کہانی کا پلاٹ سامنے نہ منڈلائے میں
کاغذ داغدار کر ہی نہیں سکتا۔ عموماً جو واقعات میرے رو
برو وقوع پذیر ہوتے ہیں میں انہی کو ضبط تحریر میں لایا
کرتا ہوں"۔

تو کیا یہ کہانی بھی ایک سچائی ہے"

"جی ہاں" میں نے بے تامل جواب دیا۔

بڈھیا برابر خراٹیں بھر رہی تھیں۔

"آپ کو کہاں جانا ہے؟" میں نے موضوع سخن بدلنے کی سعی کی۔

"ہمیں ساگر جانا ہے" لڑکی نے سر ہلاتے جواب دیا۔

"کیا آپ دہلی میں رہتی ہے؟" کچھ مزید جاننے کی ٹوہ میں کہہ گیا۔

"نہیں! دراصل دہلی میں میرے بڑے بھیا رہتے ہیں۔
وہاں وہ کسٹم آفیسر ہیں۔ ان کے پاس گئے تھے۔ دادی
میرے ہمراہ ہے"

اب کی بار لڑکی نے اپنائیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''آپ بھی سو جائیے رات کافی بیت چکی ہے''

''مجھے سفر میں نیند کم آتی ہے''

کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ وہ خاتون مشرق کی ورق گردانی میں مشغول تھی۔ دفعتاً اُس کی زبان کام کرگئی۔

''ہاں تو آپ نے اپنی بابت کچھ نہیں بتایا''

''میں ایک معمولی کہانی کار ہوں، کشمیر کا رہنے والا ہوں۔ اور اس وقت جبل پور جا رہا ہوں''

''آپ کا نام بہت ہی پیارا ہے'' لڑکی نہ جانے کس جذبے کے تحت کہہ گئی۔

''بھئی میرا نام ہی پیارا ہے''

''نہیں آپ بھی تو اچھی شخصیت کے مالک جان پڑتے ہیں''

''میرا اصلی نام عندلیب اختر مرزا ہے۔ قلمی نام عندلیب کاشمیری۔ ہاں تو آپ نے اپنا نام بتایا ہی نہیں''

میرا نام نسرین ہے'' لڑکی نے جھٹ جواب دیا اور مجھے دزدیدہ نظروں سے گھورنے لگی۔

''آپ جبل پور میں ملازمت کررہے ہیں یا کاروبار کے سلسلے میں جارہے ہیں۔'' لڑکی نے جسم سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

''جی نہین! ملازمت کے سلسلے میں میرا قیام آج کل جموں میں ہے۔''

''تو آپ جبل پور کس غرض سے جارہے ہیں''

دوشیزہ کی رگ تجسس پھڑک اُٹھی

''میں اپنے سسرال جارہا ہوں''

''تو کیا آپ شادی شدہ ہیں۔'' لڑکی کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔

''جی ہاں! خدا کے فضل سے ایک عدد بیٹے کا باپ بھی ہوں''

اتنا سننا تھا کہ لڑکی کی حالت غیر ہوتی چلی گئی۔ غصے اور نفرت کے نقوش اس کے چہرے پر نمایاں ہونے لگے۔ اس کی معصوم و پرکشش آنکھوں میں جیسے خون اُتر آیا ہو۔

''تو اب تک آپ مجھے بے وقوف بنا رہے تھے''

یہ کہتے ہی نسرین نے ''خاتونِ مشرق'' میری جانب عجب انداز میں پھینک دیا اور حقارت بھری نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔ جیسے میں نے اُسے کسی طرح کا دھوکہ دیا ہو۔ لڑکی کے اس غیر متوقع رویے پر تعجب ہوا۔

''دادی مجھے نیند آرہی ہے۔ اب اُٹھ کے بیٹھ جاؤ۔ کسی کا کیا بھروسہ۔۔۔۔''

اب تو لہجہ میں ترشی کا عنصر غالب تھا۔

دادی کے جاگنے کے بعد لڑکی برتھ پر لیٹ گئی۔ گو کچھ ثانئے قبل اس کی آنکھوں میں نیند کے خمار کی جھلک تک نظر نہ آتی تھی۔

مجھ پر لڑکی کے اس بدلتے رویے کے باعث اضطرابی کیفیت طاری ہوگئی۔ ''خاتونِ مشرق'' رسالہ اور ''بے ثمر سچ'' افسانوی مجموعہ بیگ میں رکھ کر کروٹ بدل کر میں نے بھی سونے کی کوشش کی۔

ٹرین پوری رفتار سے چل رہی تھی۔ سارے کمپارٹمنٹ میں فقط گاڑی اور پنکھوں کے چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اسی دوران میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔۔۔ ایک جھٹکے کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔

اب تو ڈبہ کیا بلکہ سارا کمپارٹمنٹ خالی خالی لگ رہا تھا بہت سے مسافر گوالیار سے ساگر تک اُتر گئے تھے۔ نسرین بھی دادی کے ساتھ اُتر گئی تھی۔ اس کے برتھ پر ایک عمر رسیدہ شخص بیٹھا تھا۔

میں نے سرہانے کی ہوا نکال کے اِسے بیگ میں رکھا۔

''آپ کا نام عندلیب ہے'' عمر رسیدہ شخص مجھ سے مخاطب ہوا

''جی ہاں''

اس نے کاغذ کا پرزہ قمیض کی اگلی جیب سے نکالے میری جانب بڑھا دیا۔

''میری سیٹ پر بیٹھی محترمہ نے تمہارے لئے دیا ہے۔ وہ ساگر اسٹیشن پر اُتر گئی''

تذبذب کی حالت میں خط کی گدازیوں میں جھانکنے لگا۔

عندلیب صاحب

آج میں جان گئی کہ کہانی کاروں کے دلوں میں محبت نام کا جذبہ ناپید ہوتا ہے۔ وہ فقط معصوم لڑکیوں سے مذاقاً رابطہ بڑھاتے ہیں اور جی بھرنے پر ان کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیتے ہیں۔ آپ نے بھی اصلیت ظاہر نہ کر کے میرے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی۔

عندلیب صاحب دراصل لڑکیوں کو غلط ڈگر پر گامزن ہونے کی تحریک مردوں سے ہی ملتی ہے۔ التماس ہے کہ دوسروں کی کوتاہیوں کو اُجاگر کرنے کے بجائے اپنی ذاتی علتوں و کمزوریوں کو دور کرنے کی تگ و دو کریں۔

نسرین نے اپنے دل کا غبار تو نکال دیا اور افسوس یہ کہ مجھے صفائی میں کچھ کہنے کا موقع بھی نہ ملا۔

بھنورا

جواد صاحب کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اچھا کاروبار چل رہا تھا۔ پشمینہ، شال اور ریشمی ملبوسات کی تیاری و فروخت کے سلسلے میں ریاست سے باہر بھی قیام کرنا پڑتا۔ سردیوں میں بمبئی اور پھر مسقط میں کچھ مہینے گذارنا اُس کا معمول بنا تھا۔ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔

بس ایک سال کے اندر ہی جواد کے آباد گھرانے میں ویرانی نے ڈیرا جمانا شروع کر دیا۔ یکے بعد دیگرے والد صاحب، چھوٹے برادر اور اپنا اکلوتا بیٹا قاسم ہمیشہ کی نیند کیا سو گئے کہ جواد کے بلند حوصلے دم سکت پڑنے لگے۔ اتنی بڑی حویلی میں اب لے دے کے اُس کی شریک حیات کلثوم اور بیٹی صبا رہا کرتی تھی۔ ساتھ میں صادق بابا خادم کے طور بچپن سے اِس گھرانے سے وابستہ تھا۔

جواد صاحب کی کاروباری دنیا بھی سکڑ کر رہ گئی اور اب اُس کا سرمائی سفر کچھ ہفتوں پر محیط دہلی تک محدود ہو کے رہا تھا۔ جواد کو بیٹی صبا سے بے انتہا محبت تھی۔ اب بیٹی ہی اُس کی تمام تر توجہ کا مرکز تھی۔ غرض اُن کی تمام اُمیدیں اُسی سے وابستہ تھیں۔ صبا بلا کی ذہین اور روشن دماغ تھی۔

جواد صاحب نے صبا کی تعلیم و تربیت کا خاص انتظام کیا تھا۔ اُس نے دُنیوی تعلیم

کے اعلیٰ مقام کو حاصل کیا کر لیا کہ جواد صاحب کو جیسے مسرتوں کا خزانہ ہاتھ لگا ہو۔ غریبوں اور مسکینوں میں نقدی و کپڑے بانٹنے کے علاوہ جان پہچان والوں کے لئے شہر کے مشہور ہوٹل ''ممتاز'' میں ضیافت کا اہتمام بھی کرایا۔

جواد صاحب چاہتے تھے کہ اگر دینوی تعلیم کے ساتھ ساتھ صبا کے لئے دینوی تعلیم کا بندوبست بھی کیا جائے تو بہتر رہے گا۔ اس طرح سے وہ زندگی کے مسائل کامیابی کے ساتھ سُلجھا سکے گی۔ وہ ایک قابل اور با اعتماد شخص کی تلاش میں تھے کہ اُن کی ملاقات مولانا ندیم سے ہوئی۔ وہ بچپن میں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ میٹرک کرنے کے بعد مولانا صاحب مذہبی تعلیم حاصل کرنے کی خاطر دیوبند (یوپی) چلے گئے تھے۔ اور آج کل سرکاری اسکول میں دینیات پڑھانے پر مامور ہیں۔ اس کے علاوہ ایک مقامی روزنامہ میں کالم نویسی کا کام بھی سنبھالا ہے۔ جواد صاحب کو مولانا صاحب معتبر و با اعتماد لگے اور اُن کو اپنے ساتھ گھر لایا۔

''یہ ہیں مولانا ندیم صاحب میرے بچپن کے شناسا۔ یہ
آج سے اس حویلی میں رہینگے اور صبا کو عربی اور مذہبی تعلیم
سے روشناس کرینگے۔ ساتھ میں میری غیر حاضری میں
صادق بابا کی شرکت میں آپ لوگوں کا خیال رکھینگے۔''

جواد صاحب نے بیگم صاحبہ اور بیٹی صبا کو اپنا دوٹوک فیصلہ سُنا دیا اور خود بغل والے دالان میں گھس آج کے اخبار کا جائزہ لینے لگے۔ مولانا ندیم دراصل کپواڑہ کے رہنے والے تھے اور یہاں مسلم اوقاف کے ایک کمرہ میں بطور کرایہ دار قیام پذیر تھے۔

گویا مولانا صاحب صبا کی دنیا میں ایک نئی شخصیت کے طور وارد ہوئے وہ بھی

ایک اتالیق بن کر۔ صبا اُن کا احترام کرنے لگی اور اُس کے لئے دل میں اتنی عزت تھی جتنی اپنے ابا کے لئے۔ لیکن فطری شوخی سے مجبور ہو کر کبھی کبھی اپنایت میں مولانا پر کوئی فقرہ چشت کر دیتی اور مولانا خوشی کا اظہار کرتے۔ الغرض مولانا نے درس و تدریس کا یہ سلسلہ بڑی دل چسپی سے شروع کر دیا۔۔۔ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بیت گئے۔ مولانا صبا کے درس کے بجائے اُس کی ذات میں زیادہ دل چسپی لینے لگے۔ اب مولانا اُسے پڑھاتے کم تھے اور دیکھا زیادہ کرتے تھے۔ پڑھاتے پڑھاتے اچانک مولانا کی نظریں کتاب سے اُٹھ کر صبا کے چہرے پر جم جاتیں اور صبا اُن کی بُری طرح گھورنے کی تاب نہ لا کر آنکھیں نیچی کر لیتی۔ مولانا کا کچھ وقت یونہی بے خودی کے عالم میں گزر جاتا اور صبا تو بس سوچتی رہ جاتی۔

ایک دفعہ مولانا عربی قاعدہ ہاتھ میں لیکر باغیچہ میں نکل آئے۔ صبا نے صادق بابا سے دو کرسیاں باہر لگوا دیں۔ اور دونوں بیٹھ کے دھرائے گئے سبق کا وِرد کرنے لگے۔۔۔۔ اتنے میں ایک بڑا کالا بھنورا صبا کے کان کے قریب آ کر گھوں گھوں کرتا رہا۔ صبا نے ہاتھ سے اُسے جھٹک دیا۔ اور بھنورا پاس ہی پھولوں کی کیاری میں منڈلانے لگا۔ اِتنے میں مولانا ندیم نے صبا کو اندازِ دگر میں گھورتے ہوئے کہا:

'بھنورا کی شکل اور آواز کتنی نفرت انگیز ہے۔ مگر اِس کے دل میں بھی محبت کی شمع روشن ہے اور یہی اِسے سدا بے قرار رکھتی ہے۔ اور اِسی بے قراری میں بھنورا گُل کی تلاش میں ختم ہو جاتا ہے۔ یہی اس کی زندگی ہے''۔

''لیکن بھنورا تو ہر گُل پر نثار ہوتا ہے اور ہر چیز کے متلاشی

کو نا اُمید ہی ہونا پڑتا ہے''۔

نہ جانے مولانا کس سوچ میں غرق تھے کہ صبا کے جواب سے لاجواب سے ہو گئے۔

چند روز بعد صبا نے اوپری گیلری سے ایک نادارد کو کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ خود اندر چلی گئی۔ صادق بابا کو دریافت کرنے کے لئے بھیجا۔ لیکن وہ شخص بے دریغ زنانہ کی طرف آرہا تھا۔ صبا اِس جرأت پر غصہ سے بے تاب ہو گئی۔ لیکن نادارد کی شکل وصورت دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

یہ تو مولانا تھے لیکن داڑھی مونچھ غائب تھی۔

صبا مولانا کی یہ حالت بھانپے بے اختیار ہنس پڑی اور جھٹ اَمی کو آواز دی۔ بیگم جواد نے آکر اِس حلیہ کی تبدیلی کی وجہ دریافت کی تو مولانا نے اپنے لال پیلے دانت نکال دئے اور مسکرانے کی کوشش کرتے فرمایا

''بس یونہی! دراصل بات یہ تھی کہ خضاب وغیرہ کے
اِستعمال سے داڑھی میں کہیں کوئی سفید بال رہ جاتا ہے
اور یہ عمر کے راز کو فاش کردیتا''۔

گویا اس ڈھلتی عمر میں ندیم کی خوبصورت نظر آنے کی یہ پہلی کوشش تھی۔ ویسے ناک بڑی، آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے اور رنگ بھی نیم گندمی! اس کے بعد بھی ندیم کو اپنی شکل کے متعلق اب بھی بڑی غلط فہمی تھی۔ داڑھی کی وجہ سے اُن کے چہرے سے کچھ عظمت و بزرگی ٹپکتی تھی اب وہ بھی جاتی رہی۔ رہی سہی صورت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ اور اُس کے ساتھ ''مولانا'' کا معزز سا نام بھی مختصر ہو گیا۔ وہ اب صرف ندیم بن کر رہ گئے۔

جوادصاحب کچھ ماہ بعد گھر واپس لوٹے۔ یہ خبر سُن کر ندیم بہت خوش ہوئے۔ وہ اپنے اصل کو اور حقیقت کو بھول چکے تھے اور آج وہ اپنا مدعا بیان کرنے کے لئے بے قرار تھے۔ نہ معلوم کیوں اُن کو یہ خیال ہو گیا تھا کہ صبا بھی اُن کی ہم خیال ہے۔ ندیم نے آج خوبصورت نظر آنے کی کوشش میں کریم وغیرہ کا آزادانہ استعمال کیا تھا۔ چہرے کی جُھریاں کچھ ماند پڑ گئی تھیں۔ شیو نیا بنوایا تھا۔ نئی شیروانی پہن کر خوشبو وغیرہ لگا کر جوادصاحب کے حضور میں حاضری دی۔

جوادصاحب کو اُن کے ندیم بننے کی خبر مل چکی تھی اِس لئے اُنہیں دیکھ کر کوئی خاص حیرانی نہ ہوئی۔

کاروباری معاملات سے بات گھریلو حالات کی جانب چلی تو ندیم نے فرمایا

''صبا اب جوان ہو گئی ہے آپ نے اُس کے متعلق کچھ سوچا''

''میں تو مصروف رہا۔ تم گھر پر رہتے ہو، کچھ کوشش کی ہوتی اور پھر تمہارے علاوہ اس کام کو کرے گا کون؟''

جوادصاحب کی باتوں سے ندیم دلیر ہو گئے اور قدرے اطمینان سے فرمایا

''یہ تو میں نے پہلے ہی جان لیا تھا اور اس لئے اس کا انتظام بھی کر لیا ہے''

''سچ''

''ہاں سچ''

''تو کون سا گھر دیکھا ہے آپ نے؟''

''بندہ حاضر ہے اور صبا کو دل و جان سے چاہتا ہے اور شاید صبا۔۔۔۔۔۔

ندیم صاحب اپنے داہنے ہاتھ سے اپنے سر کے سفید بالوں کی جڑوں کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے جواد صاحب کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ کو حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ جواد صاحب کا چہرہ غیض وغضب سے بھرا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ ردعمل میں کچھ کہہ دیتا۔ اُس نے خونخوار نظروں سے ندیم کو گھورا۔۔اور اِس کے ساتھ ہی بیگم جواد ایک برقع پوش خاتون کے ہمراہ گوشۂ راست سے برآمد ہوئی۔

''سُنتے ہو جی! یہ اِس مردُود مولانا کی شریک حیات ٹھہری، اس کی دو بچیاں بھی ہیں اور دو مہینے سے اِس نے رقم بھی خرچہ کے لئے اِن کو نہیں بھیجی ہے۔ کھوسٹ کہیں کا، سینگ کٹا کر بچھڑوں میں داخل ہونے کے خواب دیکھتا ہے''۔

یہ سُنتا تھا کہ ندیم ندامت وشرمندگی کا مُجسمہ بنے جواد صاحب کے قدموں میں ڈھیر ہوگیا۔

''جواد بھائی مجھے معاف کردو، میں واقعی کمینہ ہوں کہ اپنی اوقات فراموش کئے چاند کو چھُونے کی تمنا کی تھی۔ میں بہک گیا تھا مجھے معاف کیجئے''۔

اِس کے ساتھ ہی شریک زندگی کا ہاتھ پکڑ کر حویلی سے ایسے چلا گیا کہ جیسے کسی طرح کا رابطہ یا واسطہ ہی نہ رہا ہو۔



راکھ ہوتی زندگی

جان سے پیاری راشدہ

آج میں اپنی بے نام اور اُجاڑ زندگی سے بہت دُور جا رہا ہوں۔ ایسی جگہ جہاں کوئی آشنا میرے تعارف کا سبب نہ بن سکے۔۔۔ ایسی جگہ جہاں اجنبیت کے سائے چار سو پھیلے ہوئے ہوں۔ شاید اسی طرح میرے ضمیر کا ثقیل بوجھ کسی قدر ہلکا ہو سکے۔

منشیات جن کا میں عادی رہا۔۔۔ اِسی منشیات نے نہ صرف یہ کہ مجھے تباہ وبُرباد کر دیا بلکہ میرے سارے خاندان کو بھی مایوسی و بدنامی کے غار میں دھکیل دیا۔ واقعی اس اصلیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک شخص کی غلطی کی وجہ سے سارے خاندان کو اِس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

تمہارا قصور فقط اتنا تھا راشدہ کہ بدزبانی و بدکلامی کے شیوہ کو تم نے شروع سے ہی اپنا رکھا تھا۔ تمہاری زندگی تباہ ہونے میں یقیناً اس بدزبانی کا بھی اہم کردار رہا ہے۔۔ طلاق کی وجہ صرف میرا وطیرہ نہیں بلکہ تمہاری کج روی بھی تھی۔

تم نے بدزبانی اپنائی اور میں نے بددماغی کی راہ پر گامزن رہ کر طلاق دی۔ اب احساس ہو رہا ہے کہ دینی تعلیم کی کمی ہونے کی وجہ سے میں طلاق کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔ اور جب جانا تو بہت دیر ہو گئی تھی۔ تیر کمان سے نکل چکا ہے۔۔۔۔ بخدا مجھے احساس نہیں تھا

کہ طلاق تلوار سے بھی زیادہ تیز دھار بن کر ازدواجی زیست کو کاٹ کے رکھے گا۔

یقین کر لو راشدہ کھنڈر نما مکان میں ننگی فرش پر لیٹا ہوں کوئی پُرسان حال نہیں۔۔ ماضی کی سنہری یادیں میرے غم زدہ جسم پر رینگ رہی ہیں۔۔۔ یاد کرو اپنے دوست ندیم کی شادی میں تمہیں دیکھا تھا۔ اُسی وقت تمہیں رفیقِ حیات بنانے کا من ہی من میں فیصلہ کرلیا۔ میری شادی کی بابت والدین پریشان تھے۔ وہ میرے لا اُبالی پن کی وجہ سے کوئی رائے قائم نہیں کر پاتے تھے۔

میں نے بہن رضیہ اور ماں سے بات کی۔۔۔ وہ دونوں ندیم کے گھر گئیں تم وہاں موجود تھیں۔ اُنہیں بھی تم پسند آئیں۔

گھر کے بزرگوں میں بات طے ہوئی اور ہم ازدواجی رشتے کی اہم منزل کو چُھونے میں کامیاب ہوگئے۔۔۔ تقریباً تین برس ہماری ازدواجی زیست محبت کی خوشگوار جھونکوں سے شاداب ہوتی رہی۔ پھر نہ جانے ہماری بشاشت کو کس کی نظر لگ گئی کہ خوشگوار زندگی خزاں کے زرد پتوں کی طرح مُرجھانے لگی۔

خلاف توقع گھر میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہنگامہ آرائی ہوتی تھی۔۔۔ اس نحوست کے سبب ہمارے گھر کا سکون جاتا رہا۔ میں اندر ہی اندر گھٹتا رہا۔ سب کے ہوتے ہوئے بھی اپنے کو اکیلا محسوس کرتا۔ تم مجھ سے شکایت کرتی۔ گھر والے بھی مجھ سے شکایت کرتے میں کس کی سُنتا۔ میں ذہنی تناؤ کے حصار میں مقید رہا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جواب دینے لگی۔

منشیات کا استعمال تمہیں پا کر میں نے ترک کیا تھا۔ اب پھر عادی بننا پڑا، میرے دوستوں کا کہنا تھا کہ اگر میں منشیات کا استعمال کرتا رہوں گا تو مجھے گھر کی تمام پریشانیوں

سے نجات مل جائے گی۔۔ دھیرے دھیرے یہ زہر جسم میں اُترتا رہا۔ اور یہ راز فاش ہوتے ہی گھر کی پریشانیوں اور ہنگاموں میں خاصہ اضافہ ہوا۔۔ گھر والوں نے مجھے سنبھالنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ سارے وعدے توڑ کر اس زہر کو اپنے کمزور جسم کے اندر اُتارنے پر مجبور ہوتا تھا۔

الغرض منشیات کی لت نے مجھے پورے طور نکما بنا کر رکھ دیا۔

گھر کے غیر متوازن ماحول کے باعث میرے ذہن میں ایک نئی بات آئی کہ رشتہ انسان پر بوجھ بن جائے اُسے توڑنا ہی اچھا ہے۔ یہ خیال دل میں آتے ہی میں نے سب کے سامنے اور موجودگی میں طلاق کا لفظ تین بار دھرایا۔

۔۔۔میری اس حرکت سے زبردست کہرام مچ گیا۔ خلافِ اُمید میرے والدین مجھ پر برس پڑے جیسے تم اُن کی سگی اولاد ہو۔ میرا خیال تھا طلاق دینے سے والدین و بہن خوش ہونگے کیونکہ وہ سب تمہاری سخت کلامی سے بیزار تھے۔۔۔ لیکن اب مجھے احساس ہوا کہ تم جیسی بھی تھی میرے والدین اس بات پر ہرگز تیار نہ تھے کہ میں تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنے سے جُدا کردوں۔

میرے والدین کی زبردست خفگی اور ضمیر کی بیداری نے ندامت کا احساس دلایا۔

تیر ترکش سے نکلا تھا۔ میں کف افسوس مَل کے رہ گیا۔ دراصل اپنا غصہ تمہارے اوپر اُتارنے کی غرض سے مجھے اِس قدر کرخت قدم نہیں اُٹھانا چاہئے تھا۔

افسردہ دِلی کے ساتھ اَبا نے تمہیں والدین کے گھر پہونچایا۔

۔۔۔اب منشیات کا ہی سہارا ہے

اپنی غلطیوں کے اعتراف کے طور میں یہ نگری اور شہر چھوڑ کے اس ویرانے میں آیا ہوں۔۔۔اجنبی شہر جہاں کی ہر ہستی اور چیز میرے لئے اجنبی ہے۔

واقعی کبھی کبھی اِنسان کی معمولی سی غلطی یا ادنیٰ بُھول سے صدیوں کے رِشتے لمحوں میں ٹوٹ پُھوٹ جاتے ہیں۔

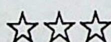
خدا کرے تمہارے سارے غم خوشیوں اور شادمانیوں میں بدل جائیں۔

تمہاری زندگی میں ایک بار پھر بہار آ جائے۔

یہ میری دعا ہے۔خدا حافظ

میں ہوں تمہارا گناہ گار

تابش



تُرش رُو

زینت عجب جھگڑالو قسم کی عورت تھی۔ ساری بستی میں شاید ہی کوئی ایسا گھر ہوگا جو اُس کی لڑائی جھگڑے سے بچا ہو۔۔۔۔ ذرا سی بات اُس کے مزاج کے خلاف ہوئی تو وہ ہنگامہ کھڑا کر دیتی۔

یوں تو بستی کی اکثر خواتین زینت کی تُرش روی سے نالاں تھیں لیکن اُس کی دھونس و بدکلامی کی وجہ سے ظاہراً اُس کی عزت بھی کرتی تھیں۔۔۔۔ زینت کے دو جوان بیٹے تھے۔ وہ جب کسی سے مصروف جنگ ہوتی تو اپنے دونوں بیٹوں کا حوالہ دینا نہ بُھولتی۔ گھمنڈ کے ساتھ کہتی۔

"میرے بھی اللہ رکھے دو بیٹے ہیں۔ شیروں جیسے،
میرے بدخواہوں اور تیرے پیاروں وعزیزوں کو ٹھکانے
لگانے کے لئے کافی ہیں"۔

اس کے بعد زینت حسب عادت اپنے مدمقابل کو ایسی ایسی ننگی گالیاں دیتی کہ سُننے والے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونستے۔ زینت کا خاوند جمال ایک دُبلا پتلا سا انسان تھا۔ جب تک حالات بہتر تھے اور بیٹے کم سن تھے وہ زینت کے ساتھ جُوں تُوں کر کے گذارا کرتا رہا۔ بستی کے نکڑ پر مسجد کے پاس جمال کی کریانے کی دُکان تھی۔

زینت نے اپنی کج روی اور گندی طبیعت کے باعث اُس کی زندگی بھی اَجیرن کر رکھی تھی۔ جمال اُس کی روز روز کی بک بک سُن کر خاموش رہتا۔ بیوی کی کرخت مزاجی کا وہ خوگر بن چکا تھا۔ اُس کی تُرش و تلخ باتیں سُننے کا عادی۔۔۔۔ جمال نے اپنی تمام اُمیدیں لڑکوں سے وابستہ کردی تھیں۔

وقت گذرتا گیا۔ کئی بہاریں آئیں اور خزاں زدہ ماحول میں تحلیل ہوگئیں۔ جمال کو اس احساس نے بُری طرح غم زدہ بنالیا کہ دونوں لڑکوں پر بھی ماں کا اثر غالب ہے۔

زینت کی بدخصلتی سے لبریز طبیعت روز بہ روز عروج کو پہنچ رہی تھی۔ جمال نے بچوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن جوانی کی دہلیز پار کرنے والے دونوں لڑکوں کے ذہن بھی ماں کی صحبت میں رہ کر پلید ہوچکے تھے۔

جمال نے اکثر بار زینت کو بھلے بُرے کی بابت جانکاری دینی چاہی اور اِلتجا کی کہ

''بچوں کو کم از کم صلح و آشتی کے ساتھ زندگی گذارنے دیں۔
ہمسایوں کے ساتھ حُسن وسلوک سے پیش آئیں۔ جب دِن
پورے کرکے ہم اِس دنیا سے چلے جائیں گے تو اِن بچوں کا واسطہ
ان ہی لوگوں سے پڑے گا۔ جن کو تم نے اپنا دشمن بنالیا ہے۔
کیوں بچوں کا مستقبل تباہ کرنے پر تلی ہو''۔

زینت پر ان پند و نصائح کا کوئی اثر نہ ہوتا اور کرخت لہجے میں کہتی

''تم اپنا کام کرو بزدل کہیں کے! میں اپنے بچوں کی دشمن
نہیں ہوں اور اُن کو تمہاری طرح ڈرپوک نہیں دیکھنا

چاہتی۔۔۔ہم کسی سے دب کر کیوں رہیں۔"

خیر روز روز کے جھگڑوں اور خاص کر بیوی کی بدمزاجی کے باعث جمال کی صحت پر بھی بُرا اثر پڑا۔۔۔ بیوی اور بچوں کی ناروا حرکتوں کے سبب بستی کا چودھری لال دین بھی جمال سے کافی حد تک بدظن سا ہوا تھا۔۔۔جمال بھی اِس غیر متوازن ماحول کے زیر اثر کافی پریشان رہتا تھا۔ دکان پر اِس اُس طرح کی باتیں سُن کر وہ اپنے آپ کو کوستا۔۔۔ وہ اب کمزور ہو چکا تھا اور زیادہ تر گھر کے احاطے میں اخروٹ کے درخت کے نیچے پرانی کھاٹ پر لیٹے کھانستا رہتا۔ زینت اور بچوں نے اُس کی گرتی صحت کی جانب کوئی خاص توجہ نہ دی۔

دراصل جمال زینت کے رنگ میں نہ رنگ سکا۔ اس کا زینت کو بڑا دُکھ تھا۔ اور پھر وہ خودسَری کے گھوڑے پر سوار جمال کو یہ احساس دلانا چاہتی تھی کہ وہ کسی کام کا نہیں۔۔۔وہ سمجھتی تھی کہ جمال سے کھنچے کھنچے رہنے سے اُس کے ٹوکنے اور ڈانٹنے کی قوت بحال ہوگی۔۔۔لیکن زینت یہ اصلیت نہ سمجھ پائی کہ جمال حقیقی طور بیمار تھا۔ اور شرافت کا دلدادہ! خیر بیوی اور بچوں کی بے توجہی سے اُس کی حالت اور بھی خراب ہوگئی۔ کچھ دن وہ بے بسی کے عالم میں چارپائی پر پڑا کراہتا رہا لیکن کسی ایک نے اُس کی خبر نہ لی۔

چودھری لال دین کو جمال کی ابتر حالت کا علم ہوا تو بھاگا بھاگا آیا۔ جمال کی پژمُردہ حالت دیکھ کر اُسے افسوس ہوا اور بولا

"اُف! اتنا تیز بُخار، اِس حالت میں تمہیں گھر کے اندر
ہونا چاہئے تھا۔۔۔لعنت ہے ایسی بیوی و اولاد پر۔۔۔
بچوں کو اتنا بھی احساس نہیں کہ تم اُن کے باپ ہو۔ چلو

میرے گھر چلو۔"

"رہنے دو چودھری! اب میں کوئی دم کا مہمان ہوں۔
میرے بیٹوں کا ذکر نہ کرو، کلیجہ چھلنی ہو چکا ہے"۔

یہ کہتے ہوئے جمال کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چند منٹ بڑبڑانے کے بعد جمال نے چودھری کی گود میں زندگی کی آخری سانس لی۔۔۔۔

خاوند کی موت کو ابھی ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ زینت نے مغلوب الغضب فطرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ہمسایہ اکبر کی بیوی نادرہ کو معمولی سی بات پر بے تحاشا پیٹ ڈالا۔ اُس کے کان کا جُھمکا اِتنی زور سے کھینچا کہ وہ گوشت سمیت اُس کے ہاتھ میں آ گیا۔ بات کچھ بھی نہ تھی۔ اکبر کی بکری رسا توڑ کے سرکنڈوں کے عقب میں دھوپ میں سوکھنے والے کپڑوں میں سے زینت کی قمیض پر مُنہ مار گئی تھی۔۔۔ صرف قمیض کے دامن کا کچھ حصہ پھٹ گیا تھا۔۔۔ عادت سے مجبور زینت آپے سے باہر ہو گئی۔۔۔ نادرہ نے بکری کی غلطی مانتے ہوئے بڑے ادب کے ساتھ معافی مانگ لی لیکن زینت کے سر پر تو جیسے بھوت سوار تھا۔ وہ اکبر اور نادرہ چھوڑ بستی والوں کے خلاف بھی بکتی رہی۔

بستی کے پیر و جواں سب کے سب چودھری لال دین کے گھر جمع ہو گئے۔ چودھری نے کچھ لوگوں کی خواہش کے بموجب معاملہ پولیس کے ہاتھوں سونپ دینے کے بجائے زینت اور اُس کے بیٹوں کا حقہ پانی بند کر دیا۔ ساری بستی میں اعلان کرایا گیا کہ کوئی زینت یا اُس کے بیٹوں سے کسی قسم کا رابطہ نہیں رکھے گا۔ غرض مرحوم جمال کے گھرانے کو برادری سے الگ کیا گیا۔ چودھری کا خیال تھا کہ اِس فیصلہ سے زینت کی تُند مزاجی میں فرق پڑے گا۔۔۔ لیکن خلاف توقع زینت نے خوشی خوشی اِس فیصلے کا خیر مقدم

کیا اور رات گئے تک مچان پر کھڑی چودھری اور اکبر کی سات پشتوں کو گالیاں بکتی رہی۔

ہفتہ بھر تو زینت اور اُس کے بیٹوں کو بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ بستی کا کوئی دکاندار اُنہیں سُودا نہ دیتا تھا۔ وہ کسی سے بات نہ کر پاتے۔ لحظہ بہ لحظہ وہ اِس تنہائی کے عادی بن گئے۔ کھیتوں میں کام کرتے اور خُوردنوش کا سامان قریب کے گاؤں سے خرید لاتے۔

زینت اب سارا دِن گھر پر رہتی۔ اب اُس میں تبدیلی آ گئی تھی۔ اب وہ اپنا غصہ بچوں پر اُتارنے لگی۔ ذرا برابر بھی قصور سرزد ہوتا تو جل بُن کر گالیاں دینے لگتی۔

ایک روز بڑے لڑکے تاج کے ہاتھ سے چینی کا پیالہ گر کر ٹوٹ گیا زینت برس پڑی۔

''حرام زادے تیرے ہاتھوں کو لقوہ ہوا ہے کیا۔ یہ پیالہ کیوں توڑا''

میرے ہاتھ چکنے تھے ماں اِس لئے سنبھال نہ سکا۔''

اس پر ماں بولی ''تیرے ہاتھوں کو قلم کیوں نہ کر دوں۔ تیرا باپ زندہ ہے جو شہر سے نیا پیالہ لائے گا''

ماں کی تلخ روی پر دونوں بھائی سکتے میں آ گئے اور وہ سوچنے لگے کہ ماں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

دوسرے روز جب دونوں بھائی صحن میں بیٹھے گنے چوس رہے تھے ڈاکیہ نے دیوار کے اندر لفافہ پھینکا۔

تاج نے لفافہ اُٹھایا اور اپنے ماموں فضل دین کی تحریر پہچانی۔

تاج اور مبارک کی منگنی ماموں کی دونوں لڑکیوں سے طے پائی تھی۔

خط چاک کرنے پر یہ اصلیت واضح ہوگئی کہ برادری سے الگ کرنے کے فیصلے کو

جانتے ہی ماموں نے منگنیاں منسوخ کر دی تھیں۔

تاج اور مبارک کی خوشیوں پر اوس پڑ گئی۔ دونوں حسرت و یاس کے ساتھ ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔

زینت کو جب اپنے بھائی کے اس فیصلے کا علم ہوا تو اُس نے پاگلوں کی طرح چیخنا شروع کیا۔

''کُتا، کمینہ، میرے لڑکوں کو اپنی لڑکیاں دینے سے مُکر گیا! لگتا ہے کہ اُس کی رگوں میں میرے باپ کا خون ہی نہیں ہے''۔

تاج آٹھویں جماعت تک پڑھا ہوا تھا۔ اور کچھ سمجھ دار تھا۔ وہ جان گیا کہ ماموں جان نے کِن حالات میں منگنیاں توڑ دیں تھیں۔ ماں کی فسادی عادات کے باعث یہ سب کچھ ہوا ہے۔

تمام حالات کا جائزہ لیتے ہوئے تاج اور مبارک نے فیصلہ کر لیا کہ وہ دونوں تھوڑا بہت سامان اُٹھا کر پاس والی پہاڑی بستی میں سکونت کریں گے۔ اُنہیں اپنی ماں سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ وہ اب اُس سے الگ رہنا چاہتے تھے۔

ایک دن دوپہر کے وقت جب وہ اپنا سامان اُٹھانے لگے تو زینت نے خشم آلود نگاہوں سے اُنہیں گھورتے ہوئے پوچھا۔

''یہ سب کیا ہے تم یہ برتن کپڑے وغیرہ کیوں اِکٹھا کر رہے ہو''

ہم اب یہاں نہیں رہیں گے'' تاج نے جواب دیا۔

''کیوں؟ یہاں کوئی ڈائن رہتی ہے کیا جو تمہیں کھائے گی''

''تم کسی ڈائن سے کم تو نہیں ہو'' مبارک نے غصہ سے کہا

یہ سُن کر زینت کی چیخ نکل گئی۔

''کمینے! تم نے اپنی ماں کو ڈائن کہا۔ خدا کرے تو

مر جائے۔۔۔ تیرے جسم میں کیڑے پڑ جائیں۔ سانپ

تم دونوں کو ڈس جائے''

یہ کہ کر سر پیٹنا شروع کر دیا۔۔۔ اُس کی چیخ پکار سُنکر آس پاس کے لوگ اپنے مکانوں کی چھتوں پر کھڑے ہو گئے۔

تاج اور مبارک نے تھوڑا بہت سامان باندھا اور کمرے سے باہر آ گئے۔ زینت یکدم جوش کے ساتھ اُٹھی اور سامان کی گھڑی تاج سے چھین لی۔

''حرام زادے۔۔ سور کی اولاد۔ تم لوگ یہاں سے کچھ نہیں لے جا سکتے۔''

''دُور ہٹ'' تاج نے ماں کو دھکا دے کر گھڑی اُس کے ہاتھ سے چھین لی۔ زینت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ پاس ہی پڑی پتھر کی سِل اُٹھا کر تاج کے ہاتھوں پر دے ماری۔ تاج شدتِ درد سے چلا اُٹھا۔

زینت کا سِل والا ہاتھ پھر ہوا میں بُلند ہوا۔

مبارک نے جھپٹ کر ماں سے سِل چھین لی اور سراسیمگی کی حالت میں اُس کے سر پر دے ماری۔

دیکھتے ہی دیکھتے زینت کے سر سے خون کا فوارہ چھُوٹا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔

آس پاس کے لوگوں نے دیکھا کہ خون میں لت پت زینت کی لاش صحن میں ٹوٹی کھاٹ پر پڑی ہے۔ مبارک کو پولیس نے حراست میں لیا اور تاج بے بسی کے عالم میں اپنی بدقسمتی پر رو رہا ہے۔

ماں بننے کا خواب

پہلے پہل سُننے میں آیا کہ ہیڈ آفس میں میناکشی کو تعینات کرنا بڑے بابو موہن کمار کو قطعاً اچھا نہیں لگا۔ میناکشی کی بابت احباب کی زبانی سُن رکھا تھا کہ وہ آزاد پنچھی کی طرح زندگی گذارنے کی دِلدادہ ہے اور غیر مناسب سلوک و ناروا عادات کے باعث اُس نے چھ ماہ کے قلیل عرصہ میں اپنے پتی سے چھُٹکارا حاصل کرلیا تھا۔

ویسے میناکشی کے پتی راجندر سنگھ کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ ہونے کے ساتھ ساتھ محکمہ مال میں ایک اچھے اور اہم عہدے پر فائز تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُن کی شریکِ حیات چراغِ خانہ کے بجائے شمعِ محفل بن جائے۔ اپنی اس چاہت کو طشت از بام کرنے پر بسے بسائے خوشحال گھرانے کی وسعتوں میں افراتفری و کدورت کے بادل منڈلانے لگے۔ کالج کی کھلی فضا میں نام کمانے والی میناکشی نے شارٹ ہینڈ کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر ٹریننگ بھی مکمل کرلی تھی۔ محکمہ برقیات میں پرسنل اسسٹنٹ کی جگہ حاصل کرنے میں اُسے کوئی خاص دِقت پیش نہیں آئی۔

اپنے بزرگوں خاص کر ماتا پتا کی خواہش کے خلاف میناکشی نے راجندر سنگھ کی

زندگی میں زہر گھولنا شروع کر دیا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ پاک و پوتر رشتہ کچے دھاگے کی صورت ٹوٹ کے رہ گیا۔ اور میناکشی پھر سے آزاد پرندے کی طرح وسیع و عریض فضا میں اُڑنے لگی۔۔۔ میناکشی کی اس غیر متوقع حرکت کے باعث ماتا پِتا پر جیسے بجلی گر گئی وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔ بچپن سے جو بے جا آزادی اپنی پہلی اولاد کو دے رکھی تھی اُس کا خمیازہ بھگت رہے تھے۔ پھر بھی جی کڑا کر کے ماں نے کرخت لہجہ اپنائے کہہ دیا کہ اُس کی اِس ناروا حرکت سے چھوٹی بہن کی زندگی بُرباد ہو کے رہ جائے گی۔ راجندر سنگھ سے ناطہ توڑنے کے بعد میناکشی کو جان پہچان والوں اور رشتہ داروں سے بھی اِس اُس طرح کی باتیں سُننی پڑیں۔ ان طعنوں کی تاب نہ لا کے اُس نے ایک آشنا کی وساطت اپنا تبادلہ ہیڈ آفس میں کرایا جس کے اراکین گرمیوں کے ایام سرینگر اور سردیوں کے ایام جموں میں گذارتے تھے۔ اب وہ قدرے مطمئین تھی کہ کم از کم سال میں چھ ماہ جلی کٹی باتیں سُننے کو نہ ملینگی۔

ویسے میناکشی زندگی کی تیس بہاریں دیکھ چکی تھیں۔ البتہ بے پناہ بناؤ سنگار کے باعث وہ انیس بیس برس کی دوشیزہ لگتی تھی۔ نئے ماڈل کے فیشن ایبل لباس پہننے کو ترجیح دیتی تھی جو مختصر و مہین ہوتا کہ جسم کے نشیب و فراز کی واضح انداز میں نمائش ہو سکے۔

قبول صورت

بھرا بھرا جسم

مختصر قد۔۔۔۔ غزالہ آنکھیں

اُبھری ہوئی پیشانی

کالے کالے لمبے گیسو اور

چہرے کے دائیں جانب آنکھ کے نیچے نگینہ کے موافق ایک سیاہ تِل، بات کرنے اور چلنے کے انداز میں غضب کا توازن۔

میناکشی کو موہن کمار کے کشادہ کمرے میں بازو والی کھڑکی کے پاس بیٹھنے کو جگہ مل گئی۔۔ بڑے صاحب کے اس فیصلے پر موہن کمار نے زبردست احتجاج کیا تھا۔ لیکن پھر میناکشی کے توبہ شکن لہجہ کے آگے اُس نے لحظہ بہ لحظہ ہتھیار ڈالنے شروع کر دیے۔ اب اِس بابت واویلا کرنے کے بجائے وہ گاہے گاہے چور نظروں سے میناکشی کے سراپا کا جائزہ لینے لگتے۔ جدید طرز کے رنگ برنگے اور معطر کپڑوں میں ملبوس میناکشی کمرے میں گھس جاتی تو آس پاس مدہوش کُن خوشبو پھیل جاتی۔ ویسے موہن کمار جبلتاً حُسن پرست تھا۔ ہر خوبصورت شے اُسے اچھی لگتی تھی۔ خوبصورت پتھروں یا کانٹوں سے بھی وہ والہانہ پیار کرتا تھا۔ میناکشی تو ایک جیتی جاگتی حُسن کی مورتی تھی۔ مہین سا چُست سوٹ یا ریشمی ساڑھی پہن کے دفتر آنا اُس نے اپنا معمول بنالیا تھا۔ برائے نام بلوز یا کھلے گلے کا کرتا پہن لیتی تاکہ سینے کے اُبھار واضح طور نمایاں ہوں۔ غرض بے حیائی سے لبریز ہتھکنڈے اپنائے اُس نے چند ہفتوں میں موہن کمار کو اپنی طرف مائل کر دیا۔۔۔۔ اب تو بسا اوقات میناکشی کے خدوخال کا جائزہ لینے کی خاطر موہن کمار نظروں کی پیاس بُجھایا کرتے تھے۔

موہن کمار تین بچوں کے باپ تھے۔ اُن کی شریک حیات بھی قبول صورت و شاداب صحت کی مالکہ تھی۔ وہ سرکاری اسکول میں ٹیچر تھی اور بچے بھی جموں میں ہی زیر تعلیم تھے۔ دفاتر سرینگر منتقل ہونے پر وہ بچوں کے ساتھ جموں میں ہی قیام کرتی تھی۔ گرمیوں کی چھٹیاں پڑنے پر ساری فیملی سرینگر آجاتی۔ موہن کمار سرکاری کوارٹر میں زیادہ تر اکیلے ہی قیام کرتے تھے۔ گھریلو کام کرنے کے لئے چپراسی کالو سنگھ کو چھوٹا کمرہ دے رکھا تھا۔

لحظہ بہ لحظہ میناکشی اور موہن کمار کے آپسی بڑھتے تعلقات کی بُو باس بند کمرے سے نکل کر دفتر کی وسعتوں میں پھیلنے لگی۔ ہر کس و ناکس کی زبان پر طرح طرح کی باتیں آنے لگیں۔ میناکشی اپنی دو سہیلیوں کے ہمراہ پاس میں ہی سرکاری فلیٹ میں رہتی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت موہن کمار کی صحبت میں ہی گذارنے لگی۔ اور صبح و شام کوارٹر میں جا کے کالو سنگھ کا ہاتھ بھی بٹانے لگی۔ الغرض میناکشی نے اپنی دل فریب اداؤں سے موہن کمار کو پوری طرح زیر کر لیا۔ اب تو ہر وقت اُس کے احساسات اور جذبات پر میناکشی سوار رہنے لگی۔ موقع ملتے ہی ٹیلی فون کرنے یا ڈکٹیشن لینے کے بہانے میناکشی بسا اوقات موہن کمار کی کرسی کے بازو پر یوُں سوار ہو جاتی کہ دونوں کے جسم ایک دوسرے سے مس ہو جاتے۔

ایک روز میناکشی دفتر نہیں آئی۔ موہن کمار پریشانی کے عالم میں غرق بے چین ہو اُٹھے۔ اصلیت جاننے کی ٹوہ میں ماتحت عملہ سے پوچھ تاچھ کر دی لیکن خاطر خواہ جواب نہ ملا۔ وہ بار بار میناکشی کی کرسی کو گھورتا جو خالی پڑی تھی۔ اتنے میں کالو سنگھ نے میناکشی کی درخواست سامنے بڑھا دی اور کہا:

''بابو جی آپ کے چلے جانے کے بعد میناجی آگئی تھی کہتی تھی طبیعت ٹھیک نہیں اور اپنے کوارٹر میں ہی آرام کر رہی ہے''۔

موہن کمار کو ایک ایک پل سال کے برابر لگنے لگا۔ اور پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہوئے بڑے صاحب سے اجازت لیکر سرکاری گاڑی میں کوارٹر کی جانب چل پڑا۔ کالو سنگھ کو اُس کی دیرینہ چاہت کے تحت شنکراچاریہ مندر جانے کی اجازت دیدی۔

میناکشی نیم عُریاں لباس میں ملبوس آرام کرسی پر براجمان ''سریتا'' کی ورق گردانی کررہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پہ شرارت بھری مُسکراہٹ تھی۔ اور آنکھوں میں خاص طرح کا خمار۔۔۔موہن کمار کے دل میں طوفان بپا ہوااور انگ انگ میں مستی بھری طراوت دوڑنے لگی۔ صدر دروازہ بند کئے الماری میں سے بوتل اور تلے ہوئے شامی کباب کی پلیٹ نکال کے سہہ پائی پر رکھ دی۔

دیکھتے ہی دیکھتے دونوں ایک دوسرے کو اندازِ دِگر میں گھورنے لگے۔ بوتل کا کاگ اُڑ گیااور سامنے پڑے جام بھرنے لگے۔ کچھ ہی دیر میں میناکشی مستی کے عالم میں جھومنے لگی۔ سینے کے اُبھار کو نمایاں کرنے کی نیت سے آنچل ہٹا دیا۔۔۔ دونوں کچھ دیر ایک عجب کشمکش میں مبتلا ہوئے۔۔رفتہ رفتہ احساس گناہ دماغ سے جاتا رہااور ایک شباب ومستی بھرا نغمہ نس نس میں گونجنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آس پاس کی مختصر دنیا بدحواسی میں جھومنے لگی۔ اور ہوس پرستی کے قہقہے فضا میں بلند ہونے لگے۔۔۔اِسی عالم میں موہن کمار نے میناکشی کو باہوں میں لیکر کمرۂ شب باشی کا رُخ کیا۔ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے کے بعد شریانوں میں خون کے بجائے دھکتے شعلے دوڑنے لگے۔

اب یہ معمول بن گیا کہ وقت ملنے پر موہن کماراور میناکشی ایک دوسرے کی ہوس کی پیاس بُجھانے لگے۔

سردیاں شروع ہوتے ہی دربار کے ساتھ دفاتر جموں منتقل ہو گئے اب تو گھر میں قیام کرنے کے سبب موہن کمار آزادانہ طور میناکشی سے نہ مل پائے۔ البتہ میناکشی کی چاہت کے تحت اُسے اپنے یارِ غار چندر پرکاش کی کوٹھی میں ایک کمرہ ورسوئی مہیا کرادی جس کا کرایہ موہن کمار ادا کرنے لگے۔ اس طرح موقع ملتے ہی وہ کچھ وقت میناکشی کی

صحبت میں گذارنے لگے۔

وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔ ہفتے مہینوں اور مہینے سالوں میں بدلتے گئے۔ اپنی سہیلیوں کی خوشگوار ازدواجی زندگی کو بھانپے میناکشی کا دِل بھی چاہنے لگا کہ کسی ایک کو اپنا ساتھی چُن لے۔ اُس کا بھی گھر بار اور بال بچے ہوں۔۔۔۔ روز روز کے ہوس پرستانہ کھیل سے غالباً اُس کا جی بھرنے لگا تھا۔۔۔ لاکھ تدابیر اختیار کرنے کے بعد بھی میناکشی اُمید سے رہی۔ وہ چاہنے لگی کہ اُس کی گود بھی آباد ہو۔ باتوں باتوں میں موہن کمار کو اصلیت کیا بتادی کہ پُر امن ماحول میں اضطراب اور پریشانی کے بادل منڈلانے لگے۔ موہن کمار کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اُس کی عزت و مرتبہ کی چادر تار تار ہونے لگی۔ لیکن ہوش وحواس سنبھالے موہن کمار نے زبان وا کردی۔

"دیکھو میناکشی یہ مذاق چھوڑ دو! یہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں شادی شدہ ہوں۔ ویسے تمہارے لئے شادی ایک قید سے زیادہ نہیں! تمہیں شادی اور بچے کا خیال ہوتا تو اپنے پتی سے ناطہ نہ توڑتی"۔

"موہن تم یہ کیا کہہ رہے ہو" میناکشی بات کاٹتے کہہ گئی۔

"میں نے اپنا سب کچھ تمہارے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ اس کا مجھے یہ صِلہ مل رہا ہے"

"صلہ نہیں بلکہ تمہیں اپنے کئے کا پھل مِل رہا ہے۔ ایک بستر کی زینت نہ بن کے تم نے بازاری عورت کا روپ دھار لیا۔ میں نے بھی بہتی ندی میں غوطہ لگایا تو اس کا

مطلب یہ نہیں کہ تم سے شادی کرلوں۔ اپنی وقعت کو

پہچانو'

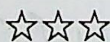
''یہ تم کہہ رہے ہو موہن'' میناکشی کی حالت غیر تھی۔

''ہاں میں کہہ رہا ہوں۔۔ میناکشی میں تمہاری کوئی مدد

نہیں کرسکتا۔ البتہ اگرتم شادی و بچہ کا معاملہ ترک کردو تو

ہمارا یہ جذباتی رشتہ برقرار رہ سکتا ہے۔''

موہن کمار کا رویہ بھانپ کر میناکشی کا چہرہ مُرجھا گیا۔ یاسیت کے آثار ماتھے پر واضح طور نمودار ہونے لگے۔۔۔ مستقبل کے ڈراونے خواب آب وتاب کے ساتھ سامنے رقص کرنے لگے۔۔۔ وہ اور اُس کی ہوش مندی ایک ساتھ ڈگمگانے لگی۔۔۔ اُس کا ''ماں بننے کا خواب'' خیالات کے محل کی طرح مسمار ہو کے رہ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وفورِ غم و یاسیت میں اُس کی کوکھ میں موجود بچے کا کچا وجود خون کے لوتھڑوں کی صورت گُھر درے فرش پر اِدھر اُدھر بکھر کے رہ گیا۔



تیرہ بختی

''ذرا ہمت سے کام لو''

وقار نے زبیدہ کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا

راستہ بہت دُور تک چلا گیا تھا۔۔۔دُور دُور تک کشادہ صاف وشفاف اور چمکتا ہوا فرش۔ یہ راستہ اُن کمروں کی طرف جارہا تھا جو دودھیا روشنی میں نہائے ہوئے تھے۔

''اُف! میں اِس حالت میں اِتنی دُور نہیں چل سکتی''

زبیدہ نے مری مری سی زبان میں کہا

''میں سہارا دوں گا تمہیں''۔ وقار اپنایت بھرے لہجے میں بولا۔

''توبہ کیسی باتیں کرتے ہو۔ دیکھنے والے کیا خیال کریں گے''

''مجھے اس کی کوئی پروانہیں ہے۔''

ساتھ ہی وقار نے ہاتھ بڑھا کر اپنے بازوؤں پر اُسے اُٹھانا چاہا۔ لیکن زبیدہ پیچھے ہٹ گئی۔

''اچھا نہ سہی! مگر کم از کم میرا سہارا تو لے لو''

یہ کہتے ہوئے وقار نے کمر کے گرد اپنا بازو ڈال کر زبیدہ کو مضبوطی سے تھام لیا اور آہستہ آہستہ چلنے لگے

زبیدہ کے جسم میں رہ رہ کر ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں وہ چند قدم طے کرتی اور درد کی شدت سے تڑپ جاتی۔ سارے بدن میں ایک کپکپاہٹ سی طاری ہوتی اور پیشانی پر پسینے کے قطرے تیرنے لگتے۔

''اپنا سارا بوجھ مجھ پر ڈال دو! تمہیں چلنے میں آسانی ہوگی''

وقار نے آہستہ سے کہا

بدلے میں زبیدہ نے لاج کے مارے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور اپنا سر وقار کے کندھے پر ڈال دیا۔۔۔آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ کمرہ تشخیص کے نزدیک پہنچ گئے۔

نرس زبیدہ کو اندر لے گئی اور وقار باہر کھڑا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر ٹہلنے کے بعد وہ بنچ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔

''یہ سب اتنی جلدی کیسے ہوگیا۔۔۔ یہ تو وقت سے پہلے ہی تھا۔ زبیدہ شام کو اچھی بھلی تھی۔ وہ حسب معمول تھکا ماندہ گھر لوٹا تھا۔۔۔۔ زبیدہ دہلیز پر بیٹھی تھی اور ایک دلفریب مُسکراہٹ سے وقار کا استقبال کیا تھا۔ پھر پانی کا گھڑا بھر لائی۔ اُس کے ہاتھ پاؤں دُھلوائے تھے۔ کتنی خدمت گذار ہے زبیدہ۔ وقار کے سینے میں تشکر و محبت کے جذبات اُمڈ آئے۔۔۔ اور وہ اکلوتی بچی فریدہ کے ہمراہ زبیدہ کے اصرار پر کھانا کھانے بیٹھ گیا۔

ہمیشہ کی طرح وہی رُوکھا سُوکھا کھانا۔

زبیدہ اُٹھی اور رسوئی گھر کی طرف گئی۔ کچھ قدم چل کر وہ اچانک چکرا کر بیٹھ گئی۔۔۔ وقار کھانا چھوڑ کر اُس کی طرف بھاگا۔ اور نہایت بے قراری اور کرب سے پوچھا کہ یہ اچانک اُسے کیا ہوگیا ہے۔۔۔ مگر زبیدہ ٹالتی رہی۔ اور انکار کرتی رہی کہ اُسے کچھ ہوا ہے۔ وہ ہمیشہ اِسی طرح اپنی ہر تکلیف وقار سے چھپاتی رہی تھی۔۔۔ زبیدہ بار بار اپنا منہ گھٹنوں میں چھپائے بیٹھی رہی تاکہ اُس کی تکلیف بھانپ کر وقار پریشان نہ ہو۔۔۔ آخر بار بار اصرار کرنے پر اُس نے بتایا کہ اُس کی طبیعت بہت خراب لگ رہی ہے۔ اور عالمِ

پریشانی میں وقار زبیدہ کو ہسپتال لے آیا۔

خدا کرے سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔

وقار نے دِل ہی دِل میں دُعا مانگی۔ اُس پر دیوانگی سی طاری تھی۔ کبھی وہ بے تاب ہو کر ٹہلنے لگتا۔ پھر آ کر بنچ پر بیٹھ جاتا۔ اُسے کچھ بھی سوجھائی نہ دے رہا تھا۔ لیکن کان دروازے پر لگے تھے اتنے میں دروازہ کُھلا

زبیدہ کو اسٹیچر پر لٹایا گیا تھا۔ اور اسٹیچر اہل کار آپریشن تھیٹر کی جانب لے گئے۔ زبیدہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے وقار کو دیکھ رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے آپریشن تھیٹر کا دروازہ بند کیا گیا۔ وفورِ غم میں وقار زبیدہ سے بات بھی نہ کر سکا۔ تھیٹر سے وابستہ کمرہ میں بُلا کر ایک فارم پر وقار کے دستخط کرائے گئے تاکہ آپریشن کرانے سے متعلق کاروائی پوری ہو سکے۔

غم واندوہ کی تصویر بنا وقار دوبارہ بنچ پر تسلط جما گیا۔ طرح طرح کے خیالات اُس کا رہا سہا قرار لوٹنے لگے۔۔۔ کتنی کمزور ہے وہ۔۔۔ کیا سب کچھ برداشت کر پائے گی۔

وقار نے دروازہ سے کان لگا کر آواز سُننا چاہی مگر اندر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ صرف قدموں کی مدھم چاپ کے ساتھ ساتھ اوزاروں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ تھیٹر اسسٹنٹ نے وقار کو تسلی دی اور وہ پھر سے بنچ پر بیٹھ گیا۔

زبیدہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ وہ خاموشی کے ساتھ اِس ناقابل برداشت تکلیف کو سہتی رہی۔۔۔ اور پھر اُس پر بے ہوشی طاری ہوئی۔۔۔۔ ڈاکٹروں نے پیٹ چاک کر کے بچہ باہر نکالا۔ نوزائیدہ کے نحیف بدن میں رتی بھر جان باقی تھی۔ چند لمحوں کے لئے زندہ رہا پھر ٹھنڈا پڑ گیا۔

زبیدہ کو اب کچھ کچھ ہوش آرہا تھا۔ اُس نے بچے کے متعلق کچھ نہ پوچھا جیسے کسی چھپی ہوئی حس نے یہ کہہ دیا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔

نرس اُسے تسلی دینے لگی۔۔۔ ''بچہ مر چکا ہے۔ آٹھویں مہینے میں جو بھی بچے پیدا ہوتے ہیں عموماً زندہ نہیں رہتے''

پھر نرس نے بچے کو اُٹھا کر اُسے دِکھایا۔ زبیدہ نے مری مری نظروں سے اُسے دیکھا زرد چہرہ۔۔ نازک نقش۔۔۔ سُوکھا بے جان جسم زبیدہ نے آنکھیں پھیر لیں۔

ممتا کی گرم گرم دھارا جو نئے سرے سے اُمڈ کر اُس کے سینے میں مچل رہی تھی سرد ہو کر یکدم منجمند ہوگئی۔

وقار کی بے قرار نظریں ابھی تک دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔

پھر دفعتاً دروازہ کھُلا

نرس باہر آئی۔ وقار بڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ نرس نے بتایا کہ بچہ نہ بچ سکا۔

لیکن وقار کو بچے کی بالکل پرواہ نہ تھی۔ اُس کے دماغ میں ایک ہی بات سمائی ہوئی تھی۔ کاش زبیدہ بچ جائے۔ اُس نے پاگلوں کے انداز میں نرس سے پوچھا۔

''وہ کیسی ہے'' اور جواب کا انتظار کئے بغیر اندر گھُسنے لگا۔ تو نرس نے ڈانٹ کر کہا۔

''ارے۔۔ ارے کہاں جارہے ہو تم۔ ابھی اندر نہیں جاسکتے۔ جاؤ پہلے جا کر اُس کے لئے قہوہ بنا کر لے آؤ۔''

''کیا کہا قہوہ! تو کیا وہ زندہ ہے۔ خداوند لاکھ لاکھ شکر ہے تمہارا''

جب وقار قہوہ لےکر آیا تو زبیدہ کو وارڈ میں پہنچا دیا گیا تھا وہ بستر پر خاموش اور نِڈھال پڑی تھی ۔ اُس کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر وقار نے اپنائیت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟''

زبیدہ کے خشک لبوں پر ایک کمزور پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور آہستہ سے لب ہلے

''اچھی ہوں''

شفقت و پیار کے ساتھ وقار زبیدہ کے لاغر جسم کو دیکھ رہا تھا اُس نے بچے کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ خیر جس کے لئے اُس نے خدائے برتر سے دُعا مانگی تھی وہ بچ گئی تھی۔ اس سے زیادہ اُسے اور کچھ نہیں چاہئے تھا۔ قہوہ کے کچھ گھونٹ اُس کے حلق میں ڈال دیئے اور پھر زبیدہ آنکھیں بند کر کے پڑی رہی۔

یوں تو زبیدہ میں کوئی جسمانی کِشش نہ تھی۔ نوجوانی میں جو ذرا کشش اور حُسن تھا وہ غربت نے اُسے چھین لیا تھا۔ اُس کا رنگ بھی وقت کے تھپیڑوں کی وجہ سے پھیکا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئیں تھیں اور اُن کے گِرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔۔ پچیس سال کی عمر میں ہی زبیدہ عمر رسیدہ نظر آنے لگی تھی۔

اگلے روز وقار سات سالہ بچی فریدہ کو ساتھ میں لایا۔ زبیدہ کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی ۔ فریدہ ماں کے سرہانے کھڑی ہوگئی اور بڑی بے تابی سے سوال کرنے لگی۔

''تمہیں کیا ہوگیا ہے اَماں۔۔ بتاؤ تو کیا ہوگیا ہے؟''

''تمہاری اُمی کو تو بخار ہے''

وقار نے زبید کی پیشانی چھوتے ہوئے کہہ دیا۔

''ماں! اپنا ہاتھ مجھے دو! میں چوم لوں تو تم جلدی اچھی ہو جاؤ گی''

اس کے ساتھ ہی فریدہ ماں سے لپٹ گئی۔

زبیدہ کی آنکھیں بھر آئیں۔سوچنے لگی کہ کتنا پیار کرتی ہے یہ معصوم مجھ سے ---- ویسے اس نے زندگی میں کون سا سُکھ پایا ہے--- سِوائے غربت، بھوک اور مصیبت کے--- لمحہ بھر کو بھی چین نصیب نہ ہوا۔

اُسی شام جب وقار دُودھ اور ڈبل روٹی لے کر زبیدہ کو دیکھنے ہسپتال آیا تو وہ نِڈھال سی پڑی تھی۔کل والی شگفتگی تو بالکل غائب تھی۔ چہرہ یکدم زرد اور کمزور پڑ گیا تھا۔ اِتنا زرد کہ معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اُس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ وقار نے ذرا جُھک کر آہستہ سے اُس کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

''اُف کتنا سرد ہے یہ ہاتھ'' بے اختیار اُس کے منہ سے نکل گیا۔

زبیدہ نے تھکی ہوئی آنکھیں بہ مشکل کھولیں۔ اُن آنکھوں میں مایوسی اور ویرانی صاف طور سے جھلک رہی تھی۔

اتنے میں لیڈی ڈاکٹر اور نرس ہال میں داخل ہوئیں۔ بیڈ نمبر ۶ کے قریب آکر نرس نے زبیدہ کے انگوٹھے سے کچھ قطرے خون کے نکالے--- خون کی جانچ کرانے کے بعد لیڈی ڈاکٹر نے وقار کو اپنے کیبن میں بُلایا۔

''جانتے ہو تمہاری بیوی کِس نازک حالت میں ہے۔ اگر حمل کے دوران میں اُسے دوُدھ، پھل، اور ٹانک وغیرہ دئے ہوتے تو آج اِس حالت میں نہ

پہونچتی ۔۔۔ جب بے چاری موت کے منہ میں پہنچ گئی تو اِسے ہسپتال لے آئے ۔۔۔

اِس کی موت ۔۔۔۔۔

''نہیں ۔۔۔نہیں ڈاکٹر صاحب اِسے کچھ نہیں ہوگا۔''

وقار نے غیر اِرادی طور بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''جس طرح بھی ہوسکے آپ میری بیوی کو بچالیجئے، میں

ہر طرح کا خرچ برداشت کروں گا۔''

اور پھر وقار نے کچھ ادویات وانجکشن حسب ہدایت بازار سے خریدنے کے لئے اپنے یار غار احمد سے قرض لیا۔۔۔ ایک معمولی کلرک اور پھر ایک بچی کا باپ اور کرایہ کا فلیٹ۔۔ مشکل سے گذارا ہوتا تھا۔ اُس نے دفتر پیدل جانا شروع کیا۔۔۔۔ سگریٹ پینا اور اخبار خریدنا چھوڑ دیا۔۔۔۔ اِنہی چند سکوں سے وہ زبیدہ کے لئے پھل خرید لیتا۔

ہسپتال میں علاج باقاعدہ ہوتا رہا۔

اس کے باوجود زبیدہ برابر اُداس سی پڑی رہتی۔ چہرے کا رنگ سفید سے سفید تر ہوتا گیا۔ خون کی کمی کی وجہ سے اُس کے ہاتھ پاؤں اِس قدر سرد ہوگئے تھے کہ اُن میں گرمی قائم رکھنے کی خاطر اُون کے دستانے وموزے چڑھائے جاتے اور گرم پانی کی تھیلیاں اُن کے نیچے رکھی جاتیں۔

زبیدہ کے چہرہ پر مانو موت کی سی سفیدی چھا گئی تھی۔

''تم بالکل فکر نہ کرو۔ بہت جلد اچھی ہوجاؤ گی۔۔۔تم

ضرور اچھی ہوجاؤ گی۔''

وقار اُسے تسلی دینے کی کوشش کرتا۔ بدلے میں ایک پھیکی اور اُداس سی مُسکراہٹ

زبیدہ کے سُوکھے لبوں پر اُبھر آتی۔

آخر وہ رات بھی آگئی جو زبیدہ اور وقار کے لئے قیامت سے کم ثابت نہ ہوئی۔۔۔۔زبیدہ اب تک ہر تکلیف خاموشی اور صبر سے برداشت کر رہی تھی۔ لیکن اب بے چینی بڑھنے لگی۔ وہ کرب کے مارے کراہ رہی تھی۔ وقار جاننے لگا کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ اُس نے آج رات وہیں پر رہنے کے لئے نرس سے بہت منت سماجت کی۔ لیکن اُس نے ایک نہ سُنی۔

''یہ ہسپتال کے قانون کے بالکل خلاف ہے کہ زنانہ وارڈ میں مرد رات کو قیام کرے۔ تم نے اسپیشل کمرہ تھوڑے لے رکھا ہے''

وقار مجبوراً زبیدہ کو بے بسی کی حالت میں چھوڑ کر رات دیر گئے واپس لوٹا۔

اُس رات درد کے مارے زبیدہ کراہتی و تڑپتی رہی۔ وابستہ وارڈ کی نرس نے آکر اُسے ڈانٹا۔

''تمہیں ذرا بھی احساس نہیں کہ دوسرے مریضوں کی نیند خراب ہو رہی ہے۔ کیوں اتنا چلاتی ہو''

صبح سویرے وقار نے ہسپتال کا رُخ کیا۔

زبیدہ خاموش اور پُرسکون پڑی تھی۔ جیسے اب اُس میں کراہنے کی سکت نہ رہی ہو۔۔ یا اُسے اب آرام ہو۔۔ وقار سوچنے لگا کہ اب زبیدہ ضرور ٹھیک ہو جائے گی،۔۔۔

اس کے برعکس ڈاکٹر نے معائینہ کرنے کے بعد کرخت لہجے میں کہا

''اب تو صرف ایک ہی راستہ ہے''

وہ کیا ڈاکٹر صاحب'' وقار نے پوچھا

''یہ کہ اس کے جسم میں خون داخل کیا جائے''

وقار فوراً ہی اپنا خون دینے کے لئے تیار ہو گیا۔

خون کا ٹیسٹ کیا گیا۔ گروپ ملنے پر پاس میں کھڑے ڈاکٹر نے تعجب سے وقار کی طرف دیکھا۔

''یہ کمزور اور سُوکھا سا انسان، اس کے جسم میں کتنا خون ہوگا جو بیوی کو دے گا''۔

''آپ میری فکر نہ کریں! اگر میرا خون اِسے زندہ رکھ سکتا ہے تو میں اپنا سارا خون دینے کو تیار ہوں''

وقار بے تامل کہہ گیا

الغرض وقار کے جسم سے گرم گرم خون نکالا گیا۔ خون زبیدہ کے سوکھے جسم میں داخل کیا گیا۔ یکدم اُس کی سکڑی ہوئی رگوں میں گرمی کی لہر دوڑنے لگی۔۔۔۔ لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔۔۔۔ وقار یہ تبدیلی بھانپ خوش ہونے لگا کہ آخر اُس کا خون دینا رائیگاں نہیں گیا۔

دفعتاً زبیدہ نے آنکھیں کھولیں۔ پیار سے وقار کی طرف دیکھا۔ پھر نحیف آواز میں کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی حالت دِگرگوں ہو گئی۔ چہرہ پیلا پڑ گیا۔ کچھ کہنے کے لئے اُس نے ہونٹوں کو حرکت دی۔ لیکن آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

وقار اُس پر جھک گیا۔ فقط ہونٹ پھڑ پھڑاتے رہے۔ بے بسی کے عالم میں زبیدہ اِدھر اُدھر کھوجنے لگی۔۔۔شاید وہ فریدہ کو دیکھنا چاہتی تھی۔ یہ سوچتے وقار تیزی کے ساتھ گھر کی جانب بھاگا اور فریدہ کو لے آیا۔

زبیدہ نے حسرت بھری نظروں سے فریدہ کو دیکھا اور پھر پیار کرنے کے لئے اپنا ہاتھ اُٹھایا مگر کمزوری کے باعث ہاتھ بستر پر گر پڑا۔۔۔اسی حالت میں کچھ وقت گذرا۔۔۔ پھر اُس نے وقار پر نظر ڈالی۔۔۔آنکھوں آنکھوں اُس سے رخصت طلب کی۔۔۔اور خدا حافظ زبیدہ سدا کے لئے اِس دنیا سے چلی گئی۔۔۔ بہت دُور۔۔۔۔۔ایک اور زندگی ختم ہوگئی۔۔۔۔۔وقار کا سب کچھ ختم ہوگیا اور وہ بچوں کی طرح پُھوٹ پُھوٹ کر رُونے لگا۔۔۔۔۔وقار اندر ہی اندر ٹوٹ چکا تھا۔ فریدہ روتے روتے بے جان جسم سے لپٹ گئی۔۔۔موت کا راز اُس معصوم کی سمجھ سے باہر تھا۔

نرس نے زبیدہ کے جسم کو سیدھا کیا اور رنگین کمبل ہٹا کر اُس پر سفید چادر اُوڑھا دی۔

سکتے کے عالم میں کھڑا وقار شریک حیات کو گھورتا رہا۔ اُس کے تمام حواس شل ہو چکے تھے۔ پھر اُس کے کانوں میں آواز آنے لگی۔

"اب تو رات کافی گذر چکی ہے۔ نعش تمہیں صبح ہی ملے گی۔ ہم جو کچھ کر سکتے تھے کر چکے، باقی ہمیں تمہاری بیوی کے مرجانے کا بہت افسوس ہے۔"

لیڈی ڈاکٹر اِتنا کہہ کر نرس سے مخاطب ہوئی۔

"خاکروبوں سے کہہ دو کہ لاش اُٹھا کر مُردہ خانے میں ڈال آئیں"

کچھ دیر بعد دو خاکروب حاضر ہوئے۔ پر انہوں نے ایک زبان ہو کر اعلان کیا

کہ لاش اُٹھانے کے بیس روپئے دیئے جائیں"

یہ منظر دیکھکر وقار بڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس سے زیادہ لاش کی توہین

برداشت نہ کر سکا۔ اور اپنی تمام تر قوت کو یکجا کر کے اُس نے زبیدہ کے مردہ جسم کو اپنے

بازوؤں میں اُٹھایا۔ نرس نے اسٹیچر آگے بڑھایا تو وقار درد و کرب سے چِلایا۔

"ہٹ جاؤ سامنے سے، کوئی ضرورت نہیں اسٹیچر کی"

اور پھر وارڈ میں موجود مختصر مجمع کو چِیرتا ہوا وقار ہسپتال کے ماحول سے باہر نکل آیا

۔کسی ایک نے بھی مداخلت نہ کی۔ فریدہ باپ کی قمیض کا کنارہ پکڑے ساتھ ساتھ چل رہی

تھی۔

جان سے عزیز زبیدہ کے بے حس جسم کو کفنانے اور دفنانے سے فراغت پائے

وقار اپنے آپ سے بے نیاز سکتے کے عالم میں کھڑا دور خلاؤں میں بے مطلب کچھ کھوج

رہا تھا کہ دفعتاً فریدہ بیٹی نے اُس کے دامن کو جھنجھوڑا

"ابُو میری اماں کہاں گئی۔ اُسے بلاؤ

ابُو۔ میں اُسے تنگ نہیں کروں گی۔ میں

ٹافی بھی نہیں مانگوں گی"۔

وقار نے زبیدہ کی نِشانی کو سینے سے لگایا اور اپنی

برگشتہ بختی پر ماتم کرنے لگا۔



صدائے بازگشت

یقین مانو راشدہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم سامنے نہیں ہو، میں تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ اکثر اوقات خلوت میں تم سے باتیں کیا کرتا ہوں۔ اِدھر جس دن سے ملازمت اختیار کرلی ہے۔ میرے دل و دماغ پر دفتر کی فائلیں اور گہما گہمی چھائی ہوئی ہے دماغ اس بدلے ماحول میں وحشت ناک قبرستان لگ رہا ہے۔ بہرحال اس سنسان قبرستان میں تمہارا گذر ہو ہی گیا۔ میں پھر اپنے اندر ان جذبات کو بُری طرح محسوس کرنے لگا جو فقط تمہارے لئے وقف تھے۔ اور ہم ایک بار پھر جھیل ڈل کی وسیع و عریض گود میں واقع چھوٹے سے جزیرے کے کنارے ایک دُوسرے کے روبرو تھے، گھنے چنار کے نیچے نرم نرم قالین نما گھاس پر بیٹھے راز و نیاز کی باتیں کرنے لگے۔

یاد ہے، چاند نے اپنی نورانی صورت لئے ہر شئے کو منور کردیا تھا۔ ہمارے سامنے دُور دُور تک پھیلا صاف وشفاف پانی کا لامتناہی سلسلہ تھا۔ اس جھیل میں راشدہ تمہارے خیالات کی وُسعت تھی۔ تیری دل فریب آنکھوں کی نیلاہٹ اور تمہارے دل کی گہرائی تھی۔ اس دل آویز جھیل میں دیکھتے ہی دیکھتے چھوٹی چھوٹی موجیں نمودار ہوئیں اور ہر موج میں مانو ایک چاند ڈوبا ہوا تھا۔۔۔ چاندنی میں ملبوس موجیں ناچتی اُچھلتی اور کودتی ہمارے قدموں تک آرہی تھیں اور اپنے ساتھ لائے چاند کو ہمارے قدموں میں چھوڑ کر

واپس جارہی تھیں۔ نہ جانے کتنے چاند ابھرے تھے جو اس جھیل کی بسیط گود میں دم توڑ رہے تھے۔ لیکن میں ان لوازمات سے بے نیاز تمہارے چہرے کو تکتا تھا۔ پُراز جذبات چہرہ، کالی کالی چمکدار آنکھیں۔۔۔ یاقوت جیسے لب، کشادہ پیشانی اور برسات کی راتوں کی طرح سیاہ اور گھنی زلفیں۔۔۔ میں بت بنا تمہیں تک رہا تھا۔۔۔ کچھ یاد ہے مجھے سکتے کے عالم میں دیکھ کر تم جھینپ سی گئی اور اس کے مٹانے کی خاطر تم سامنے والی پہاڑی کے دامن میں واقع خوشنما بنگلوں و کوٹھیوں کو دیکھ کہنے لگی۔ ''شادی کے بعد تم بھی ایک ایسا بنگلہ بنا دینا''

''یہ سب سرمایہ داری کے محل ہیں جو لاچاروں اور غریبوں
کا خون چوس کر تعمیر ہوئے ہیں یہ ریت پر کھڑے ہیں۔
ہمارا محل تو محبت کی سنگلاخ زمین پر تعمیر ہوگا''۔ میں نے
بے تامل جواب دیا تھا۔

تم حسبِ عادت روٹھ گئیں میں نے فرطِ محبت میں اپنا سر تمہاری گود میں رکھ کر لیٹنے کی کوشش کی۔ تمہاری نظریں جھک گئیں اور پھر میرے اُلجھے ہوئے بے ترتیب بالوں میں اپنی نرم و نازک انگلیوں سے کنگھی کرنے لگیں۔ اُف کتنا سکون اور آرام مجھے اس وقت ملا تھا۔ جب تم نے اپنا ماتھا میری پیشانی پر رکھ دیا تھا۔

۔۔۔۔ تم میرے بالوں سے بدستور کھیل رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا ان عالیشان محلوں کے بارے میں اور پہاڑی کے دامن میں جھیل کے کنارے پھیلے جھونپڑیوں کے بارے میں۔ میں کلب والی عالیشان بلڈنگ کو دیکھ رہا تھا جسکی وسعتوں میں چند فرنگی اور نیم مشرقی مرد و خواتین زندگی کی لذتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔۔۔

اُف تفریق کی کیسی گھناونی تصویر ہے کہ ایک طرف ہزاروں خاندان جھونپڑوں میں بے سروسامانی کے عالم میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔۔۔انہیں سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی اور دوسری طرف رقص کا بازار گرم ہے۔شراب کے پیالوں کی جلترنگ بج رہی ہے۔اس کلب بال میں سینکڑوں خاندان پناہ لے سکتے تھے۔۔۔۔لیکن ایسا نہیں ہو رہا ہے۔۔۔ایسا نہیں ہوگا کیونکہ اس ناچ ورنگ کے مقابلے میں ان ہزاروں انسانوں کی زندگیاں بے وقعت ہیں، یہ کلب سرمایہ داروں کے لئے عیش وعشرت کا سامان فراہم کر رہا ہے لیکن یہ دیرپا نہیں۔۔۔میرے نزدیک ان محلوں سے لاکھ بہتر وہ جھونپڑے ہیں جو مکروفریب کی بستی سے دُور اپنائیت کو فروغ دینے میں پیش پیش ہیں۔

''اگر تم راضی ہو تو ان جھونپڑوں تک تمہارا ساتھ دوں''۔یہ تم بولیں۔

''ان جھونپڑوں میں پھیلاؤ ہے راشدہ! ان کی گود میں انسانیت پلتی ہے۔

ہاں ہاں ان جھونپڑوں میں لاچاری اور مفلسی کے مدھر مدھر نغمے سننے کو ملتے ہیں۔۔۔۔یقین کرلو مستقبل قریب میں ان جھونپڑیوں میں قیام پذیر افراد ساری دنیا پر راج کرینگے''۔

''تو پھر پہاڑی لڑکی سے شادی کیوں نہیں کرتے''۔تم نے بیزاری کے عالم میں مشورہ دیا۔میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔۔۔اور ان آنسوؤں میں ایک پہاڑی لڑکی کا وجود اُبھرا۔اُس کا نام گل جان تھا جس کا جنم جھونپڑے میں ہوا تھا۔پتھروں اور آبشاروں سے کھیلتی جوان ہوگئی تھی۔گل جان بہادر اور جفاکش لڑکی تھی اور تمہاری طرح خوبصورت بھی۔۔۔سورج نکلنے اور ڈوبتے تک بوڑھے باپ کا ہاتھ بٹاتی۔۔۔۔کچھ وقت پہلے گل جان اپنے دو بھائیوں بہن اور والدین کی شرکت میں بشاشت بھری زندگی گزر رہی تھی لیکن

شہر بھر میں انسانیت سوز واقعات کیا رونما ہوئے کہ یہ پہاڑی بستی بھی بربریت وتباہی کا ہدف بن گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دہشت گردی کی آڑ میں ہزاروں افراد لقمہ اجل بن گئے جن میں گل جان کے دو بھائی اور بہن شامل تھے۔ ماں یہ جان گسل منظر دیکھتے ہی کٹی شاخ کی طرح زمین بوس ہوگئی۔ اس کا ساتھ بھی سدا کے لئے چھُٹ گیا۔ گل جان کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی۔ ہم خیال سہیلیوں سے مل کر سلامتی وامن کا جھنڈا تھامے موت کے سوداگروں کے خلاف آواز بلند کی۔۔۔۔ بستی بستی گھومتے رہے۔ حیوان صفت لیڈروں کو یہ اچھا نہ لگا۔ ایک دن موقع پا کر بدفطرت ٹولہ کے اراکین گل جان کو لے اڑے جب کہ شام کو کھیت سے گھر واپس لوٹ رہی تھی۔۔۔۔ وہ مدد کے لئے کافی چلاتی رہی لیکن بے سود۔۔۔ کسی نے گل جان کے باپو سے کہا کہ ''اس کی بیٹی سیٹھ ستار کے بنگلے میں قید ہے اور اس کی عزت خطرے میں ہے''۔

لاغر ہونے کے باوجود رحمان بابا ہمت کر کے سیٹھ کے بنگلہ کی طرف تیزی سے چل پڑا لیکن وہاں پہنچ کر اُسے بیٹی کی لاش دیکھنے کو ملی۔۔۔۔ اس کی آنکھیں گل جان کی لاش دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔۔۔ گل جان نے اپنی عزت وآبرو بچانے کی خاطر بنگلہ کی تیسری منزل سے کود کر جان دی تھی۔

۔۔۔۔۔۔ راشدہ مجھے اب بھی گل جان یاد آتی ہے اس کی یادگار اب بھی ڈل کے کنارے اپنے ہونے کا اعلان کر رہی ہے۔۔۔۔ آفرین اس پر کہ آبرو پر آنچ نہیں آنے دی۔۔۔۔ کاش میں اُن دنوں جیل کی چار دیواری سے باہر ہوتا۔۔۔ مجھے وہ لڑکی بہت پسند تھی راشدہ!۔۔۔۔ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔۔۔ تم کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ تمہارے گلابی چہرے کا رنگ آن کی آن میں خزان رسیدہ پتوں کی صورت اختیار کر

گیا تھا۔۔۔تم برابر خاموش تھی۔۔۔غالباً میرے ہرجائی پن کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

یقین کرلو راشدہ میں ہرجائی نہیں ہوں نہ تھا۔

اتنے میں تم میری باہوں سے جدا ہوگئیں۔۔۔میں سکتے کے عالم میں غرق راشدہ اپنی بے بسی پر ماتم کرنے لگا۔۔۔اُف دیکھتے ہی دیکھتے راشدہ میرے خیالات کی لڑی ٹوٹ گئی۔۔۔میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم مجھے ٹھکرا کر کسی اور کے نشیمن کو روشن کرنے کی حماقت نہیں کروگی۔۔۔تمہاری طرف سے خاموشی برابر جاری ہے۔۔۔یہ خاموشی راشدہ مجھے بے موت مارے گی۔خدارا ازراہِ انسانیت اس خاموشی کو توڑ دو۔۔۔مجھے سہارا دو!

فقط تمہارا شہباز



ایک پہلو یہ بھی ہے

امتیاز غریب گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ اُس کے والد بختیار احمد مقامی ابرائشم کارخانہ میں ادنیٰ درجے کے ملازم تھے۔ امتیاز کے علاوہ دو بیٹیوں کے پالن پوشن اور شریک حیات کی مسلسل بیماری کے باعث بختیار کو اقتصادی بحران نے بُری طرح اپنے چنگل میں لے رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کم سنی میں ہی دونوں لڑکیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے بجائے سلائی اور بُنائی کے مقامی سینٹر میں سوزن کاری کا ہنر سیکھنے کی غرض سے داخلہ لینا پڑا۔ شالوں اور اونی کپڑوں پر گُل کاری کرنے میں دونوں بہنوں نے زبردست مہارت حاصل کرلی۔۔۔ ماں تو پہلے پہل چرخہ کاتا کرتی تھی۔ لیکن تپ دِق کے موذی مرض میں مبتلا ہونے کے باعث وہ یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکی۔ اب تو یہ حالت تھی کہ معمولی سی محنت کا کام کرنے سے اس کی چھاتی میں درد اُٹھتا تھا۔ اور سانس پھولنے لگتی تھی۔

ایک نیم مذہبی ادارے سے وظیفہ حاصل کرنے اور اخبار کی ایجنسی سے اخبارات وجرائد اُٹھائے بستی کے متمول گھرانوں میں صبح سویرے ڈالنے کے عوض امتیاز کو کچھ آمدنی بھی ہونے لگی۔ جس کے باعث وہ تعلیم و تربیت کے میدان میں متوازن انداز میں آگے بڑھنے لگا۔

وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے امیتاز نے گریجویشن کا امتیازی زینہ بلا کسی دِقت کے طے کرلیا۔

بختیار کی کوششوں سے امتیاز کو ابریشم کارخانے میں کلرک کی جگہ مل گئی۔ دیگر اوصاف کے علاوہ امیتاز میں ایک عادت یہ بھی تھی کہ دن بھر کی روئیداد رات کو سونے سے قبل ڈائری میں قلم بند کرلیا کرتے تھے۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ امیتاز کا کاغذ داغدار کرنے کا جذبہ خوب جوہر دکھانے لگا۔ اب اخبارات و دیگر جرائد میں اُس کی تحریر کردہ مقالے اور سیاسی وسماجی طرز کے مضامین شائع ہونے لگے۔ انفارمیشن آفیسر حاجی عبدالستار کے اکلوتے بیٹے انور کو پڑھانے کے بدلے اِسے معقول معاوضہ ملنے لگا۔ غرض اس طرح امیتاز اپنے والدین کا ہاتھ بٹانے میں کامیاب اُترا۔

حاجی عبدالستار کی سفارش پر امتیاز ایک غیر ملکی معروف ریڈیو اسٹیشن کے لئے نمائندہ خاص کی حیثیت سے فرائض انجام دینے لگے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں امتیاز کلرک کی ملازمت کو خیر باد کہہ کر وقایع نگار کے طور پر شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ پریس کالونی میں اِسے کوارٹر کے ساتھ ساتھ ٹیلی فون اور اسکوٹر جیسی بنیادی سہولیات بہ آسانی حاصل ہوگئیں۔

تحریکی دور میں امتیاز نے اچھا نام کمایا۔ سرکاری وغیر سرکاری تقریبات کے علاوہ فوجی عسکری اور تحریکی کاروائیوں کی بابت اُس کی رپورٹنگ وتبصروں کی سراہنا کی جانے لگی۔ دراصل کسی بھی عسکری یا سیاسی واردات کو جاہ ونمود کی خاطر بڑھا چڑھا کر پیش کرنے سے وہ سدا ہی دور رہتا تھا۔ ہر واقعہ کی اصلیت جاننے کی چاہ میں پابندیوں وخطرات کے

باوجود امیتاز بڑی ہمت وحوصلے کے ساتھ جائے وقوع پر پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ کچھ اعلیٰ فوجی وعسکری ذمہ داران کے ساتھ اس کا رابطہ بنا ہوا تھا۔ جس کے باعث امتیاز کو اپنے فرائض ادا کرنے میں کسی خاص مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔

کشمیری قوم کو یہ علت غالباً ورثہ میں ملی ہے کہ جب کوئی فرد محنت ومشقت کے بل پر ترقی وکامرانی کی منزلیں طے کرلیتا ہے تو اس کے اکثر واقف کار یا ہمسایہ لوگ خوش ہونے کے بجائے من ہی من جل اُٹھتے ہیں۔ امتیاز کو بھی اس ناروا سلوک کا ہدف بننا پڑا۔ انتھک محنت کے بدلے حاصل کردہ کمائی سے امتیاز نے ماڈرن ہاوسنگ کالونی میں عالی شان بنگلہ تعمیر کرایا۔ ساتھ ہی پریس کمپلیکس میں دفتر کے لئے موزون جگہ دستیاب ہوئی ۔ کچھ تنگ نظر احباب کی آنکھوں میں امتیاز کی یہ کامیابی کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔

ایک روز درجن بھر وردی پوش جوان دفتر میں گھس آئے اور امتیاز کو حراست میں لیئے ون ٹن میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ پریس اور میڈیا مراکز میں سراسمیگی سی پھیل گئی۔ ملکی ومقامی اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے امیتاز کی بے وجہ گرفتاری کا خوب چرچا رہا۔ جس کے نتیجہ میں امتیاز کو تین دنوں کے بعد ہی رہا کیا گیا۔ البتہ زیر حراست کچھ زیادتیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ بھی اس بات کو لے کر کہ امتیاز کا کچھ تحریکی وعسکری زعماء سے رابطہ بنا ہوا ہے اور ان کی سرگرمیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔

حسبِ سابق امتیاز کی تحریر کردہ بے باک اور جاندار تبصرے میڈیا اور اخبارات کی زینت بنتے گئے۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں ڈھلتے گئے۔ بختیار منزل رنگ برنگی روشنی کے لاتعداد قمقموں سے بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ امتیاز کی بڑی بہن رضیہ کی شادی خانہ آبادی کی رسومات دھوم دھام کے ساتھ انجام دی گئیں۔ رخصتی کی تقریب میں کچھ

سیاسی ، عسکری اور سماجی ہستیوں کے علاوہ ذرائع ابلاغ کے اراکین اور کچھ نامی گرامی صحافیوں نے شرکت کی۔ دراصل امیتاز کے لنگوٹئے یار انجینئر اسد اللہ ریاض سے شادی رچائی گئی۔ امتیاز نے اپنے والدین اور چھوٹی بہن رفیقہ کے ہمراہ رضیہ کو خوشی کے آنسوؤں کے ساتھ رخصت کردیا۔

اگلی رات دیر گئے جب کہ رضیہ کہ عارضی جدائی کے غم میں گھر کے مکین اُداس اُداس سے بیٹھے تھے۔ اچانک صدر دروازے پر دستک ہوئی۔ امتیاز نے جلدی سے دروازہ کھول دیا یہ دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی کہ سامنے دو نقاب پوش کھڑے تھے ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ ایک نقاب پوش آگے بڑھا اور زبان وا کردی۔

"ہمارے عسکری زعیم کو فورسز کے جوانوں نے زدرکوب
کر کے چنار باغ میں اَدھ مرا چھوڑ دیا ہے حالت کافی
نازک ہے۔ وہ آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ جلدی
ہمارے ساتھ چلئے۔"

امتیاز نقاب پوش کی بات سن کر پریشان سا ہوا۔ وقت ضائع کیے بغیر اپنا ٹیپ ریکارڈ اور کیمرہ اُٹھایا۔ اور تھری ویلر میں بیٹھ کر طوفان کی مانند گھر والوں کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

رات پریشانی کی حالت میں گذری۔ صبح ہوئی لیکن امتیاز واپس نہیں لوٹا۔ والدین و بہن کو تشویش ہونے لگی۔ طرح طرح کے وسوسے اور خیالات دل و دماغ میں اُٹھنے لگے۔

میڈیا سے وابستہ آس پاس کے افراد اُنہیں دِلاسہ دے رہے تھے کہ اتنے میں یہ

دل خراش خبر سُننے کو ملی کہ امتیاز کی گولیوں سے چھلنی لاش چنار باغ کے قریب دریائے جہلم کے کنارے پڑی ہوئی ملی ہے۔ ہر طرف کہرام سا بپا ہوگیا۔ ماتم کی صف بچھ گئی۔ لاغر ماں کی حالت بہت ہی زیادہ ابتر ہوگئی۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ پائی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک دلدوز چیخ کے ساتھ فرش بوس ہوئی کہ پھر ہوش میں نہ آئی۔۔۔اسی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہوگئی۔

آخر امیتاز کو کس جُرم کی پاداش میں یہ سزا ملی۔ دم سکت والد صرف سوچتا رہا، جان پہچان والوں کا یہی کہنا تھا کہ امتیاز کا قصور فقط یہ تھا کہ وہ عسکری وفوجی روئیداد کو اصلیت کے لبادے میں پیش کیا کرتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ کسی عسکری جماعت یا جنگجو گروہ نے امتیاز کو ہلاک کرنے کی ذمہ داری قبول نہیں کی۔

شریک حیات اور لخت جگر کے بے جان جسموں کو مقامی قبرستان میں دفنانے کے بعد بختیار دو بیٹیوں کے ساتھ اپنی بدنصیبی پر ماتم کرنے لگا۔ تینوں فرطِ غم میں پُھوٹ پُھوٹ کر رونے لگے۔

تحریک کے کرتا دھرتا کے ساتھ ساتھ سرکاری انتظامیہ کے کچھ ذمہ داران نے امیتاز کی بے وقت اور پُر اسرار موت پر اظہار تعزیت کیا۔ صحافیوں اور وقائع نگاروں کی خاصی تعداد نے امتیاز کی اس بے رحمانہ موت پر احتجاجی علم بلند کیا۔ ذرائع ابلاغ کے ادارہ نے اس جانکاہ واقعہ کی خوب تشہیر کی۔ الغرض ہر ایک نے مرحوم امتیاز کے غم زدہ والد بختیار کے ساتھ پوری ہمدردی جتائی۔ اُسے دلاسہ دیتے رہے۔

اِسی دوران ضلع حکام نے ریاستی سرکار کی جانب سے دو لاکھ روپے کی رقم امتیاز کے باپ کو دینے کا باضابطہ اعلان کردیا۔ یہ اعلان کیا ہوا کہ بختیار کے چہرے کا رنگ

بدلنے لگا۔ اس کے تن بدن میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ نہایت افسردگی کے عالم میں اس نے مری مری آواز میں کہا:

"صاحب۔۔۔ آپ دو لاکھ کی بات کرتے ہیں۔
آپ مجھ سے چار لاکھ روپیہ لے لو۔۔۔ یہ ساری جائیداد
لے لو۔۔۔ اور میرے بیٹے اور شریک حیات کو واپس
لوٹا دو۔ آخر میرے بیٹے نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔۔۔ اس
نے حالات سے سمجھونہ کر کے اصولوں کی ڈگر سے ہٹنے کی
حماقت کبھی نہیں کی۔ میں پوری طرح سے لٹ گیا، اب جینے
کے لئے میرے پاس رہا ہی کیا ہے"۔

اتنا کہہ کر بختیار وفورِ غم سے کٹی شاخ کی طرح زمین بوس ہو گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے مختصر نفوس پر مشتمل گھرانہ پھر سے ماتم کدہ میں تبدیل ہو گیا۔ رضیہ اور رفیقہ پر تو مانو مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ دونوں بہنوں کی حالت لوگوں سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ والد کی لاش کے پاس وہ دم بخود بیٹھی تھیں۔

الغرض ایک اور گھرانہ تباہ و برباد ہوا اور وہ بھی تحریک کی آڑ میں انسان اور انسانیت کو تہس نہس کرنے کی خاطر یہ دو پاؤں کا حیوان ناطق اور نہ جانے کیا کچھ گل کھلائے گا۔ یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا۔



تصویر کا دوسرا رُخ

فضا ساکن تھی اور جنگل اُداس! ہر طرف سکوت۔۔۔خاموشی کا عالم تھا۔شام کے ملگجے سائے پھیل چکے تھے۔ وہ کافی دیر سے بوڑھے چنار کی گھنی چھاؤں میں بیٹھی تھی پھر وہ بے قراری اور اضطراب کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی ۔ دور دور تک درختوں اور جھاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ پاس ہی ایک برفانی نالہ بہہ رہا تھا۔اس نے اپنے کھلے بے ترتیب بالوں کو سمیٹا اور پاس پڑے بید کے ٹکڑوں کی مدد سے نا تمام پٹارا مکمل کرنے لگی۔ پٹارا بُنتے بُنتے اس کی آنکھوں میں پانی کے قطرے تیرنے لگے اور پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ وہ سوچ میں ڈوبی اپنے گردوپیش کا غائرانہ طور پر جائزہ لینے لگی۔ وہ اب بھی کافی حسین ودلکش تھی۔ میانہ قد اور چھریرے بدن کی ، دلکش خدوخال اور مسحور کردینے والی نگاہیں مگر اتنے اوصاف کی حامل ہونے کے باوجود وہ حددرجہ مضمحل رہتی تھی۔ پٹارا اور بید کے ٹکڑوں کو کھلے چنار میں چھوڑ کر وہ چشمے کی جانب بڑھنے لگی۔ پانی کے دو چار گھونٹ حلق سے نیچے اُتار کر وہ بڑے ٹیلے پر بیٹھ گئی۔ جہاں سے بستی کے گھاس پھونس کے بنے ہوئے کئی چھپر صاف نظر آرہے تھے جس بستی کو خیر باد کہہ کر وہ اس سنسان بیابان میں رہنے لگی تھی ۔ سرد آہ بھر کر وہ سہمی سہمی نگاہوں سے اس پگڈنڈی کی طرف دیکھنے لگی جس نے اُسے یہاں آنے میں مدد کی تھی۔

وہ سوچ کے بحرِ بے کراں میں غرق تھی کہ پاؤں کی چاپ نے اِسے چونکا دیا۔ قدموں کی چاپ قریب آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ اَدھ کھلی آنکھوں سے خوف زدہ ہرنی کی طرح چاروں طرف دیکھنے لگی۔

''اب بھی تم میرا پیچھا نہ چھوڑو گے؟''

''کروں کیا راحت! یہ میرے بس کی بات ہو تب نا۔ میں سچ کہتا ہوں جب سے تم بستی چھوڑ کر چلی گئی ہو مجھے بستی اور بستی کی ہر چیز کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ راحت تم سے دور رہ کر مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔۔ مجھ پر یقین کرو۔''

''یقین وہ بھی ایک مرد پر؟''

''خدا جانتا ہے راحت میں دل لگی نہیں کر رہا۔ تمہارے بغیر مجھے کچھ بھی اچھا نہین لگتا۔ کھانا پینا نہ سونا میں نے کبھی اطمینان کا سانس نہ لیا۔ تم میرے سانسوں میں رچ بس چکی ہو۔ تمہیں اپنے قریب نہ پا کر میری حالت ابتر ہو جاتی ہے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ راحت تم میری زندگی ہو۔ میری دنیا۔۔۔۔''

''تمہاری دنیا؟ وہ بھی ایک عورت؟ نہیں نہیں''

''پلیز راحت مذاق مت اُڑاؤ۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے مجھے کم از کم وجہ تو بتا دو۔ تمہیں اس حال میں دیکھ کر میرا سکھ

چین لٹ گیا ہے ۔ میں تمہیں دل وجان سے
چاہتا ہوں اسی دن سے جب اس پہاڑی بستی میں قدم
رکھا تھا اور تمہیں پن چکی کے پاس دیکھا تھا۔ یاد ہے
راحت تم نے میرا ساتھ چودھری کے گھر تک دیا تھا۔ اسی
گھڑی سے میں دل ہی دل میں تمہیں چاہنے لگا تھا کیا
میری محبت پر تمہیں یقین نہیں؟ راحت بات ٹال کر مجھے
بے موت مت مارو"۔

"محبت اور وہ بھی مجھ سے؟ ۔۔۔۔واہ کیا بات کہی ہے۔
میں پھر کہتی ہوں اگر اپنی خیر چاہتے وہ تو میری نظروں
سے دور ہو جاؤ۔ میں تمہاری یا کسی اور کی صورت بھی نہیں
دیکھنا چاہتی۔ تم سب خونی بھیڑیے ہو۔ وحشی درندے
ہو۔ محبت کے نام پر بدنما داغ ہو۔ میں کہتی ہوں چلے
جاؤ"۔

"اور تم راحت؟"

"میں پوچھتی ہوں کہ میری فکر کرنے والے تم کون ہوتے
ہو! میں جہاں ہوں جس حال میں ہوں تمہیں اس سے کیا
واسطہ؟ اپنی خیریت چاہتے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ۔
ورنہ میں بھر گئی تو جان کے لالے پڑ جائیں گے"۔

"راحت میں تنہا واپس کیسے چلا جاؤں جب کہ تم سے

میری زندگی کی دھڑکنیں وسانسیں وابستہ ہیں"

"جھوٹ۔ ایکدم فضول و بے بنیاد تم چاہتے ہو کہ میں پھر
سے اس بستی کو اپنالوں جہاں عصمت و آبرو کے پیرہن
دولت وہوس کے عوض تار تار کر دیئے جاتے ہیں۔
سنو! شہری بابو! یہ دنیا انسانوں کی بستی نہیں بلکہ حیوانوں کا
مسکن ہے۔ انسان کب کا مر چکا ہے۔ تم میری نظروں
سے دور ہو جاؤ۔ تم میرے ارادوں کو کسی طرح متزلزل
نہیں کر سکتے۔ مجھے تمہارے احسانوں کی ضرورت نہیں۔
میرا خدا میرے ساتھ ہے۔"

اس کے ساتھ ہی راحت کے چہرے کی رنگت بدلنے لگی۔ ماتھے پر غم وغصہ کے آثار واضح انداز میں اُبھرنے لگے۔ اس کا سارا جسم نامعلوم خوف سے لرزنے لگا۔ ایک دل شکن یاد کے باعث راحت کے ہوش وہواس گم ہونے لگے۔ راشد نے راحت کو سہارا دیتے ہوئے پھر کہا

"راحت تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کچھ منہ سے تو کہو۔ تمہاری
خاموشی مجھے مار ڈالے گی"

راشد نے راحت کو جھنجوڑا اور پھر اس کے سر کو زانوں پر رکھ کر پریشانی کے عالم میں غرق اس کے سراپا کا جائزہ لینے لگا۔ راحت پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ اس حالت میں راحت اور بھی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔

راشد نے پہلی بار راحت کا لمس محسوس کیا تھا۔ آج اس کی محبوبہ اس کے

روبرو بے حس وحرکت پڑی تھی۔ راشد کے دل میں کتنی آرزو تھی کہ راحت لمحہ بھر کے لئے ہی اس کے بازوؤں کے حلقے میں آجائے یا اس کی گود میں اپنا سر رکھ دے لیکن راحت نے کبھی اس کا موقع نہیں دیا۔ آج راحت کا نازک جسم اس کے قبضہ واختیار میں تھا تو وہ کچھ نہ کرسکا۔ حسرت بھری نگاہوں سے اِسے دیکھتا رہا۔ چند منٹوں کے بعد راحت کو ہوش آیا تو وہ تیزی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی اور غصے سے بولی۔

''تم ابھی تک یہیں ہو شہری بابو! میں پھر کہتی ہوں کہ میرا پیچھا کرنے سے تمہیں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ ارے بابو تم رو بھی رہے ہو لیکن کیوں؟ کیا واقعی تم مجھے چاہنے لگے ہو؟ کہہ دو یہ سب جھوٹ ہے، غلط ہے۔ افسوس تم اتنی دور نکل آئے۔ خدا کے لئے اب بھی واپس لوٹ جاؤ۔ شہر میں تمہیں ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی مل سکتی ہے جو مجھ سے لاکھ درجہ بہتر ہوگی۔ میں تو دھول ہوں دھول جو پاؤں تلے روندی جاتی ہے یا فضاؤں میں بکھر جاتی ہے''۔

''راحت یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تمہیں اس تکلیف میں دیکھ کر کیا میں چین سے رہ سکوں گا؟ ہر گز نہیں۔ میں تمہارے بغیر جینا یا زندہ رہنا بے معنی سمجھتا ہوں۔ میری آنکھوں کی روشنی، کانوں کی سماعت اور دل کا قرار تم ہو، فقط تم۔''

راشد کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ دل کا لاوا آنکھوں کی راہ سے

پھوٹ پڑا۔ اپنا اُترا ہوا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپائے راشد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ راحت کا دل درد سے بھر گیا وہ بولی۔

''بابو! مرد ہو کر روتے ہو۔ کیا تم کسی بھی طرح مجھ سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتے ؟ یقین کرو کہ میں اب تمہارے یا کسی اور کے لائق نہیں ہوں بابو! میں اب وہ راحت نہیں رہی ہوں جس کی تمہیں جستجو ہے، چاہ ہے۔ بابو وہ راحت مر چکی ہے۔ اب اس راحت کو کوئی نہیں پا سکتا۔ تم بھی نہیں۔ تمہیں جس راحت کی تلاش ہے وہ تو روندی جا چکی ہے''۔

''آخر کیا بات ہے کہ جس کے باعث میں تمہیں پا کر خوش نہیں رہ سکتا۔ راحت کاش تم میرے دلمیں جھانک کر دیکھ سکتیں آخر کیا وجہ ہے کہ تم مجھے نہیں چاہتیں؟ بتاؤ راحت خاموش کیوں کھڑی ہو۔ میں جواب چاہتا ہوں۔ راحت تمہیں میری قسم''۔

''بابو کیا کرو گے سُن کر! میری زندگی میں فقط سسکیاں اور آہیں ہیں۔ پس اتنا جان لو کہ میں ایک زندہ لاش ہوں'۔

''راحت کیا میری یہ حالت دیکھ کر بھی تمہیں میری محبت پر یقین نہیں آتا میری باتوں پر تمہیں اعتماد نہیں راحت کچھ تو بتاؤ کہ تم اپنے آپ کو بربادی کے غار میں

دھکیل دینے پر کیوں آمادہ ہو؟ تمہیں اُس ہستی کا واسطہ جو

تمہیں اس دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے ۔ مجھے

اصلیت سے باخبر کردو میں تمہارا غم بانٹنا چاہتا ہوں''۔

''بابو بس کرو۔ آگے کچھ نہ کہو بہتر یہی ہے کہ میری

محبت کو دل سے نکال دو اور واپس چلے جاؤ۔''

دونوں جانب خاموشی چھا گئی۔ مکمل سکوت! ایک دوسرے پر نگاہیں مرکوز کرنے کے بجائے دونوں پاس ہی بنفشہ کے جھنڈ کو دیکھنے لگے۔ بنفشہ کے پھولوں کی مہک فضا میں پھیل رہی تھی ۔ راشد نے غیرارادی طور پر بنفشہ کی جھکی ڈالی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ معاً جھاڑیوں کی اوٹ میں سے رونے کی آواز آنے لگی اور خاموش ماحول میں کھلبلی سی مچ گئی۔ راشد کی حالت غیر ہوگئی۔ وہ حیران و ششدر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

راحت جھاڑیوں کو ہاتھوں سے اِدھر اُدھر کرتی سُرعت کے ساتھ تھوتھے چنار کی جانب بڑھی اور ایک معصوم بچے کو گود میں لئے راشد کے مقابل کھڑی ہوگئی۔

''یہ دیکھو بابو! غور سے دیکھو۔ کیا اس ننھی سی جان کو دیکھنے

پر بھی میری تمنا کرو گے۔ بتاؤ بولتے کیوں نہیں؟ تمہاری

زبان پر تالے کیوں پڑ گئے؟''

''راحت یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟''

''کیوں جوش موھم پڑ گیا۔۔۔۔؟ محبت کا بُھوت

سر سے اُتر گیا؟ مجھے اپنانے کو ٹھانی تھی وہ ولولہ کہاں گیا۔

میں تمہاری زندگی تھی وہ جذبہ کیا ہوا؟ بابو پسینے سے بھیگ

کیوں گئے؟ میں جانتی تھی کہ اصلیت جاننے کے بعد
تمہارا جوش ٹھنڈا پڑ جائے گا اور میرے لیے تمہارے دل
میں نفرت جاگ اُٹھے گی۔ آخر تم بھی تو شہری بابو ہو۔
ٹھیک اس منے کے بابو کی طرح۔ اس نے جس طرح مجھے
برباد کیا میں بیان نہیں کر سکتی۔ وہ کرایہ دار کی حیثیت سے
ہمارے گھر میں بسا تھا اور میں اس کے لئے بیٹی جیسی تھی
لیکن اُس بدطنیت نے میری سادہ لوحی کا اس طرح ناجائز
فائدہ اُٹھایا کہ ایک دن۔۔۔ میں بے بس تھی کچھ کر نہ سکی
عورت ہونا ہی بذاتِ خود ایک کمزوری ہے۔ اس نے مجھ
سے وہ گوہر گرانمانہ چھین لیا جس کی حفاظت دل و جان
سے کرتی آئی تھی۔ اور پھر مجھے سدا کے لئے اپنا بنانے کا
فریب دے کر وہ اس بستی سے ایسا غائب ہوا کہ اب تک
واپس نہیں آیا۔ جب کہ وہ جانتا تھا کہ میں اس کے بچے
کی ماں بننے والی ہوں۔۔۔ بابو میں تو ماں ہوں میں
اپنے بچے کو جان سے نہیں مار سکتی اسی لئے اس بیابان میں
زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں صرف اس ننھی سی جان
کے لئے، جگر کے ٹکڑے کے لئے، سماج سے دور، بستی
سے الگ اور اپنوں سے جُدا۔ میں اس قابل نہیں کہ بستی
والوں کے سامنے سر اونچا کر سکوں۔۔۔ مجھ میں اب

زندہ رہنے کی حسرت ناپید ہو چکی ہے۔ بابو تم چلے جاؤ،
مجھے ستانے سے تمہیں کیا ملے گا۔ میں تو اب ایک زندہ
لاش ہوں۔۔۔اس بچے کے لئے زندہ ہوں۔ میں ممتا کا
گلا نہیں گھونٹ سکتی اور ہاں بابو! اس لٹیرے۔۔۔خونی
بھیڑیے کی میری پاس ایک نشانی بھی ہے۔ دیکھتے جاؤ،
ہوسکتا ہے کہ کبھی وہ شہر میں مل جائے۔ وہ بھی تو شہر ہی کا
تھا، تمہاری طرح ۔مل جائے تو یہ نشانی اِسے واپس
کردینا۔"

"یہ ہے اس معصوم کا باپ۔۔۔۔یہ تصویر اسی کی ہے"

راحت۔۔۔یہ۔۔۔۔میں۔۔۔کیا۔۔۔۔دیکھ۔۔۔رہا۔۔۔ہوں"

"میرے بابا۔۔۔۔" اپنی ہی تصویر کا دوسرا رُخ دیکھ کر راشد کے ہوش اُڑ گئے۔
چاروں طرف اندھیرا چھانے لگا۔ آئینے میں اپنا ہی عکس دیکھ کر اس کی آنکھیں پتھرا گئیں
اور وہ اوندھے منہ گر گیا۔ راحت نے بچے کو تھوتھے چنار میں چھوڑ راشد کو سہارا دینے کی
کوشش کی لیکن بے سود۔ روح نے راشد کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔



جینے کا سہارا

مہینہ ستمبر کا اور چودھویں کی شب۔ نیلے آکاش کی وسعتوں میں چاند پوری آب وتاب کے ساتھ ضوفگن ہوکر ساری کائنات پر نور کی چادر بچھا رہا تھا۔ خوش کن سبک خرام ہوا چاروں اور پھیل کر ٹکرانے سے درخت وجد میں آکر آہستہ آہستہ جھوم رہے تھے۔ آس پاس پُرفضا ماحول، نشۂ نیند میں چُور تھا۔ البتہ صفیہ شب باشی کے کمرے کے کشادہ پلنگ پر بیٹھی اپنی برگشتہ بختی ولاچاری پر ماتم کناں تھی۔ اُس کے بغل میں ننھا صغیر آرام سے سو رہا تھا۔ صفیہ نے بھی سونے کی کوشش کی لیکن بے سود۔۔۔ دالان میں آکر آرام کرسی پر دراز صفیہ دُور خلاؤں میں گھورنے لگی۔۔۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ کتنی بدقسمت ہے۔ زندگی بھر وہ راحت ومسرت کے لئے ترستی رہی۔۔۔ اُس نے فرط محبت میں صغیر کو سینے کے ساتھ چسپاں کرکے غیر ارادی طور پر ٹرانزسٹر کا بٹن آن کردیا۔۔۔ ایک نسوانی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"آنسو کا اِک سمندر اور میں

میرے ارمانوں کا دفتر اور میں

طائرِ بے حال بے پر اور میں

بے بسی کا ایک منظر اور میں

مشکلوں کا ایک لشکر اور میں

وقت کا نادیدہ خنجر اور میں

صفیہ کے دل میں ہوک سی اُٹھی۔ وہ سوچوں کی نگری میں کھونے لگی۔ ٹی پائے پر پڑی ناصر کی تصویر پر نظریں جم گئیں۔ تصویر کے خدوخال میں گھورتے ہی گئے گذرے واقعات ایک ایک کر کے تحت الشعور میں اُبھرنے لگے۔ غمزدہ دل میں بھرالا وا آنسوؤں کی صورت آنکھوں سے بہہ نکلا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ماضی کی یادیں آب وتاب کے ساتھ صفیہ کے روبرو رقص کرنے لگیں۔

''تم کتنی حسین ہو صفیہ اور یہ خم دار شریر لٹیں

چاند سے مکھڑے کا حُسن دوبالا کر رہی ہیں''

ناصر نے اُس کے بالوں کی لٹوں کو چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا تھا۔

''چھوڑیئے۔ رائی کا پہاڑ بنا کر پیش کرنا

کوئی آپ سے سیکھے''۔ صفیہ نے کہا

''سچ صفیہ تمہاری رفاقت اور وابستگی نے میری پژمردہ

زیست میں جہاں بھر کی رعنائیاں بھر دیں ہیں۔''

صفیہ کے شیریں ہونٹوں پر ملکوتی تبسم چھا گیا اور دِل فرطِ محبت میں اُچھلنے لگا۔ ساتھ میں غیر ارادی طور زبان وا ہوئی۔

''مجھے اکثر یہ خیال ستانے لگتا ہے کہ تم مجھے چھوڑ کر تو نہیں

جاؤ گے۔۔۔اور میں''۔۔۔

''پگلی یہ تمہارا وہم ہے۔ کوئی اپنی زندگی کی رعنائی

سے کیسے دغا کر سکتا ہے۔'' ناصر بات کاٹتے گلو گیر آواز

میں کہہ گیا۔

''جانے کیوں کبھی کبھی اِس اُس طرح کے خیالات

ذہن میں اُبھرتے ہیں، جو مجھے پریشان کرتے ہیں۔''

صفیہ نے ناصر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایسی باتوں کو دل یا ذہن میں جگہ ہی کیوں دی

جائے جن کا سِرے سے وجود ہی نہ ہو۔''

یہ کہتے ناصر نے صفیہ کے سرخ سرخ انگاروں جیسے دہکتے ہوئے گالوں پر تھپکی

دیتے ہوئے کہا۔

''صفیہ تمہیں اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہئے کہ قدرت

نے ہمارے پیار کی لاج رکھی اور ہمیں سدا کے لئے

ازدواجی بندھن میں مقید کرلیا۔ اب تو زندگی کے طویل

سفر میں ہم دونوں نے ساتھ ساتھ قدم بڑھا کر مستقبل کو

درخشاں بنانا ہے''

ناصر کی پیار کی باتیں سُن کر صفیہ کے لبوں پر شادمانی اور بشاشت کے نقوش ظاہر

ہونے لگے۔ اُس کی خوابیدہ نگاہیں جھک گئیں۔

بدلے میں ناصر نے اُسے لگے لگایا۔ پیار کے ساگر میں غوطہ زن دونوں خوشی

سے جُھوم اُٹھے۔

فضاء مسکرا اُٹھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ساری کائنات میں مسرت و انبساط کی

بہار چھانے لگی۔۔۔۔ساتھ میں گئے گذرے واقعات سلسلہ وار صفیہ کے ذہن میں واضح انداز میں منڈلانے لگے۔

۔۔۔۔۔ناصر کی صفیہ سے پہلی ملاقات ذکیہ کے یہاں ہوئی تھی۔۔۔اُس روز موسم بہت ہی سُہانا تھا۔

''یہ ہیں میری شوخ اور شیریں نوا سہیلی صفیہ جس کا
ذکر میں نے آپ سے کیا تھا۔اور ہاں صفیہ یہ ہیں ڈاکٹر
ناصر میاں میرے بھائی جان''

ذکیہ نے اپنائیت کے لہجے میں مختصر سا تعارف کرایا اور خود بغل والے کمرے میں چلی گئی۔

''ذکیہ سے آپ کی بابت جاننے کے بعد آپ سے ملنے کا کافی اشتیاق تھا۔شکر ہے ذات پاک کا آج مُراد بھر آئی۔کہاں جارہی ہیں آپ؟''

ناصر نے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھ لیا۔

''میں مقامی گرلز سکول میں ٹیچر ہوں'' اتنے میں ذکیہ نمودار ہوئی اور ناصر نہ چاہنے کے باوجود وہاں سے چلے گئے۔

وقت گزرتا رہا۔اور ساتھ ساتھ صفیہ اور ناصر کی ملاقاتوں کا سلسلہ بھی دراز ہونے لگا۔دونوں لاشعوری طور پر ایک دوسرے کی جانب بڑھنے لگے۔

''اوہ آپ'' اسکول کے باہر ناصر کو پاکر صفیہ کِھل اُٹھی۔

''جی ہاں! بیماری کی دوا لینے حاضر ہوا ہوں۔

ناصر شرارتاً مسکرانے لگا۔

''ڈاکٹر میں نہیں شاید آپ ہیں''۔صفیہ بھی مسکرانے لگی۔

''کبھی کبھار ڈاکٹروں کو بھی دواؤں کی ضرورت پڑتی ہے''۔

اسی کیساتھ ناصر دزدیدہ نگاہوں سے صفیہ کو گھورنے لگا۔صفیہ نے نگاہوں کی تاب نہ لاکر نظریں جھکا لیں۔موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ناصر نے صفیہ کا امبرین زلفوں کو انگلیوں سے اُلجھا دیا۔شوخ نظریں آپس میں ٹکرائیں۔

اور پھر ''چٹ منگنی پٹ شادی'' کا جان فزا وقت بھی آ گیا۔کتنی پُرلطف اور قابلِ رشک تھی ان کی زندگی مایوسیاں اور اُداسیاں اُن کی ازدواجی زیست سے کوسوں دُور تھیں۔۔۔۔

لیکن اُس کردگار کو صفیہ کی یہ خوشیاں منظور نہ تھیں۔دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی باتوازن زندگی کے ساگر میں ارتعاش سما گیا اور نہ جانے کس بد بخت کی نظر لگ گئی کہ صفیہ و ناصر کے جیون کی کشتی منجدھار میں پھنس کے اپنا وجود کھو بیٹھی۔گویا مسرتوں بھری زندگی صفیہ کے لئے وبال جان بن گئی۔ناصر روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار بنے صفیہ کی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُوجھل ہوا۔اُس کا جیون ساتھی سدا کے لئے جُدا ہو گیا۔اُس کی زندگی کا مہکتا ہوا گلستان غم کی دھوپ سے مرجھا گیا۔اب وہ تھی اور اُس کی چاروں جانب پھیلی بے کسی اور بے بسی۔۔۔

صفیہ سوچوں کی دنیا میں گم تھی کہ پاس میں سوئے ہوئے ننھے صغیر کے رونے کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔۔۔خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔اب صفیہ تھی کمرہ شب باشی اور روتا ہوا صغیر۔صفیہ نے ماضی کے دلدل سے نکلنے کیلئے اپنے بچے صغیر کا سہارا لینا چاہا اور وہ اُسے اپنے سینے سے چمٹا کر چومنے لگی۔

''کیوں میرے لعل کیا چاہئے؟''

''ماں! ابو دان (ابو جان) کب آئیں گے؟''

اس کے ساتھ صغیر ماں کی مُشفقانہ گود میں مچلنے لگا۔ صفیہ کے دل کے زخم پھر سے تازہ ہوگئے۔ شدت غم سے اُس کی حالت ابتر سی ہونے لگی۔ اپنے آپ کو کسی طرح سنبھالتے ہوئے گویا ہوئی۔

''ایسی باتیں نہیں کرتے بیٹے''

''امی، ابو دان کہاں گئے ہیں؟''

تین برس کا صغیر توتلی زبان میں بولا اور رونے لگا۔

''وہ بہت دُور گئے ہیں بیٹا۔۔۔ بہت دُور۔۔۔

اب تم سو جاؤ! اچھے بچے ضِد نہیں کرتے''

صفیہ نے صغیر کو دلاسا دیا اور سینے سے لگائے اُسے سُلانے کی کوشش کی۔ چند ثانیوں کے بعد صغیر کو نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔۔۔ صفیہ کی بوجھل پلکیں بھی جھپکنے لگیں۔ حقیقت کی دنیا سے دُور صفیہ پھر سے خیالات کی نگری کی سیر کرنے لگی، اُسے یاد آیا کہ ایک رات اُس کا ماتھا تیز بخار سے تپ رہا تھا۔ اور دیر تک ناصر سرہانے بیٹھے سرد پانی کی پٹیاں بدلتا رہا۔ بخار کے مارے صفیہ کی حالت خستہ لگ رہی تھی۔

''ناصر بہت دیر ہوگئی ہے اب تم سو جاؤ'' صفیہ نے درد بھرے انداز میں التجا کی۔

''صفیہ تم کتنی نادان ہو۔ تم بے قراری کا ہدف بنی ہو۔ اور میں آرام کروں۔۔۔ ایسا نہیں ہوگا۔ یاد رکھو کہ

۔۔۔''

''میں کتنی بدنصیب ہوں کہ شریک حیات کے طور کسی طرح کی راحت تمہیں فراہم نہ کرسکی''۔

صفیہ نے بات کاٹتے جواب دیا۔

''صفیہ ایسا مت سوچو۔تم میری محبوبہ ہو۔تمہارے بغیر جینا بھی اب میرے لئے ناممکن ہے''

اس کے ساتھ ہی ناصر صفیہ کا سر گود میں لئے اُسے چومنے لگا۔فرطِ محبت میں صفیہ نے اپنے خشک ہونٹ ناصر کے پھڑکتے ہونٹوں سے چسپاں کردیئے۔۔۔۔

اتنے میں ننھا صغیر پھر رو اُٹھا۔صفیہ چونک اُٹھی۔خیالات کے دھارے سمٹ گئے۔اب صفیہ تھی اور ناصر کی امانت صغیر۔صفیہ نے آنکھوں کے حلقے خشک کئے ایک سرد آہ بھری اور صغیر کو بانہوں میں دبوچ لیا۔

اب تو صغیر کا وجود ہی صفیہ کے جینے کا سہارا بن گیا تھا۔اُس نے صغیر کو پالنے میں اپنا عیش وآرام داؤ پر لگا دیا ہے۔



گرگٹ صفت

پست طبقوں سے وابستہ افراد خاص کر بیواؤں اور نادار خواتین کی جانب دست تعاون دراز کرنے کی غرض سے ریاستی سرکار نے محکمہ سوشل ویلفیئر اور صنعت وحرفت کے اشتراک سے وادی کے اکثر ضلعوں میں تربیتی سینٹر چالو کر دیئے ہیں۔ جن میں سلائی، بنائی اور دیگر چھوٹی صنعتوں سے متعلق جانکاری فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ماہ بہ ماہ کچھ رقم بطور امداد بھی فراہم کر دی جاتی ہے۔ ایسے ہی ایک مقامی تربیتی سینٹر کی جانب جہاں آرا کے قدم بڑھنے لگے۔

ویسے جہاں آرا کھاتے پیتے گھرانے کی چشم وچراغ تھی۔ لیکن گردش دوراں کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ہوا یوں کہ ایک شام جبکہ جہاں آرا، ماں اور چھوٹے بھائی پرویز کے ہمراہ دُوردرشن (میٹرو چینل) کے دلچسپ پروگرام دیکھنے میں محو تھی اچانک ایک دلدوز خبر سننے کو ملی بائی پاس چوک میں سیکورٹی بنکر کے قریب نامعلوم افراد نے دستی بم پھینکا جس سے کچھ راہ گیر اور ایک فوجی جوان بُری طرح زخمی ہو گئے۔ بدقسمتی سے زخمیوں میں جہاں آرا کے والد آفتاب احمد بھی شامل تھے۔ آفتاب احمد کو دیگر زخمیوں کے ساتھ صدر اسپتال میں داخل کیا گیا۔ ان کی حالت ابتر تھی۔ خون زیادہ بہہ گیا تھا۔ دستیاب رقم سے کچھ یونٹ خون کے حاصل کئے گئے جو بے سدھ جسم میں داخل کئے گئے۔ ہر طرح کے اقدام اُٹھانے

کے باوجود حالت مین بہتری کے آثار نمایاں نہ ہو سکے۔

آپریشن کی ضرورت پڑ گئی۔شریک زندگی کو بچانے کی خاطر جہاں آرا کی ماں نے جمع شدہ پونجی اور زیورات تک داؤ پر لگا دیئے لیکن حالت میں کسی طرح کا سدھار دیکھنے کو نہ ملا۔دراصل بائیں پسلی اور سر کے پچھلے حصے میں گہرے زخم آئے تھے۔کچھ ہفتے موت وحیات کی جدوجہد کے درمیان آفتاب احمد اپنی شریک حیات، جہاں آراء اور پرویز کو روتا بلکتا چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔وہ بھی گھر کے مکینوں کو کنگال کر کے۔

جہاں آراء کی ماں یہ جانکاہ صدمہ برداشت نہ کر پائی۔غم واندوہ کی تصویر بنی وہ اندر ہی اندر برف کی سل کی طرح پگھلتی رہی۔تپ دق جیسے مہلک عارضہ نے اِسے اپنے چنگل میں لے لیا۔لمبا چوڑا خرچہ برداشت کرنے کی پاداش میں کوٹھی تک فروخت کرنی پڑی۔جہاں آراء کا کالج جانا بھی چھوٹ گیا۔اب وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہنے لگے۔۔۔۔جو بھی اثاثہ ازقسم نقدی اور جنس بچا تھا، ماں کا علاج کرانے میں صرف ہوا۔ لیکن مشیت ایزدی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ایک شام جبکہ موسم میں ارتعاش سما گیا تھا۔بادل گرج رہے تھے اور تیز ہوائیں چل رہی تھیں جہاں آراء چھوٹے بھائی کے ہمراہ ماں کے سرہانے بیٹھی اپنی تقدیر کو کوس رہی تھی کہ ماں کی دمِ شکستہ آواز گونجنے لگی۔

''بیٹی جہاں آراء۔۔۔۔کیا سوچا تھا۔۔۔۔پر کیا ہو گیا۔۔۔۔انسان۔۔۔۔خیالات کے تانے بانے بنتا رہتا ہے۔میں یہ کروں گا۔۔۔۔وہ کروں گا۔۔۔۔البتہ ہوتا۔۔۔۔وہی ہے جو پروردگار۔۔۔۔کو منظور ہوتا ہے تمہارے

ابا کی۔۔۔۔خواہش تھی کہ پڑھا لکھا کر۔۔۔۔تمہیں

ڈاکٹر بنائیں اور پرویز کوانجینئر۔۔۔۔سب خواب۔۔۔

ادھورے رہ گئے۔۔۔بیٹی التجا ہے کہ پرویز کا۔۔۔خیال

رکھیں۔۔۔اللہ تعالیٰ تمہیں حوصلہ۔۔۔۔۔''

اتنا کہہ کے دیکھتے ہی دیکھتے ماں کے چہرے کا رنگ فق ہونے لگا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیٹا بیٹی کو دیکھنے لگی۔ حالات میں سراسمیگی سمانے لگی۔۔۔۔اسی کشمکش میں اسکی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

گزربسر کرنے اور بھائی کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کی غرض سے جہاں آراء نے پیپر ماشی اور سوزن کاری کے سینٹر میں داخلہ حاصل کیا۔۔۔۔بہت جلد اس نے متعلقہ فن میں مہارت کا مظاہرہ کیا۔ ذہانت اور دانشمندی کے علاوہ خدائے برحق نے جہاں آراء کو بے مثل حسن سے بھی نوازا تھا۔۔۔۔سینٹر میں جس شخص کے ساتھ سب سے پہلے رابطہ قائم ہوا وہ تھے اشفاق جو ٹریننگ فراہم کرنے پر معمور تھے۔۔۔۔اشفاق کی شرافت اور سادگی سارے سینٹر میں مشہور تھی۔ غیر ارادی طور وہ جہاں آراء میں دلچسپی لینے لگے۔۔۔دل ہی دل میں اِسے چاہنے لگے لیکن شریف النفس ہونے کے باعث کھل کر جہاں آراء سے بات نہ کرپائے۔ اشفاق نے بارہا چاہا کہ جہاں آراء کو اپنے بے لوث محبت کا یقین دلائیں لیکن لاکھ کوشش کرنے پر بھی زبان وانہ کرسکے۔ وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔

ایک روز محکمہ کے ڈپٹی ڈائریکٹر ریاض الدین یونٹ کا معائینہ کرنے آئے۔ جہاں آراء کا سامنا کیا ہوا کر ریاض الدین کی حالت میں تغیر سما گیا۔ وہ اِسے برابر دزدیدہ

نگاہوں سے گھورنے لگے۔ سادہ اور دلکش حسن کا نظارہ کئے ریاض الدین کے ذہن میں ہوس پرستی کا جذبہ منڈلانے لگا۔۔۔۔۔ اس کے بعد کسی نہ کسی بہانے ریاض الدین متذکرہ سینٹر کے چکر لگانے لگے۔۔۔۔ اور جہاں آراء کی مجبوریوں کی بابت جانکاری حاصل کی۔ اس کی جانب بظاہر ہمدردانہ رویہ اپنانے لگے۔۔۔ ایک دن خلاف توقع ریاض الدین صبح سویرے جہاں آراء کے کوارٹر پر حاضر ہوئے۔ چرب زبانی سے کام لئے پرویز کی پڑھائی وغیرہ کی بابت باتیں کرنے لگے۔ الغرض باتوں باتوں میں اس نے جہاں آراء کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ اِسے دل و جان سے چاہتا ہے اور شریک حیات کی حیثیت سے اِسے اپنانے کی چاہ رکھتا ہے۔ پہلے پہل جہاں آراء نے احتیاط کی راہ پر گامزن اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی ہر ممکنہ کوشش کی البتہ ریاض الدین پختہ عمر کے چاپلوس شخص تھے۔ طرح طرح کے حربے اپنا کے جہاں آراء کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوگئے کہ وہ اُس کے بغیر زندگی گذارنا گناہ سمجھتا ہے۔ الغرض ریاض الدین جہاں آراء کو ہوس پرستی کے شیشے میں اُتارنے میں کامیاب ہوگئے۔۔۔ جہاں آراء نے بھی محبت کا جواب اُلفت سے دینا شروع کیا۔ سینٹر میں کام کرنے والے زن و مرد خصوصاً اشفاق کو جہاں آراء اور ریاض الدین کا میل ملاپ اچھا نہیں لگا لیکن وہ کچھ نہ کرپائے کیونکہ وہ ریاض الدین کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے مجبوراً چپ سادھے سب کچھ برداشت کرنے لگے۔

ریاض الدین کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر جہاں آراء بھی اس کی بابت زیادہ سے زیادہ سوچنے لگی۔ سیر سپاٹے کی غرض سے اس کے ساتھ جانے لگی۔ ایک روز پہلگام سینٹر کا معائنہ کرنے کا پروگرام ریاض الدین نے مرتب کیا اور باتوں باتوں میں جہاں

آراء کو ساتھ چلنے پر آمادہ کیا۔ اچانک موسم کی خرابی کے باعث حسب پروگرام واپس نہ آسکے اور رات وہیں گیسٹ ہاوس کے ایک کمرے میں گذارنی پڑی اور اسی رات جہاں آراء نے نہ چاہنے کے باوجود گوہر گرانمانہ کو کھودیا جس کی حفاظت وہ اب تک دل وجان سے کرتی آئی تھی۔ ریاض الدین کے جال میں پھنس کر وہ اِسے اپنی کشتی حیات کا ناخدا گردانے لگی۔ دونوں کا میل ملاپ بڑھنے لگا اور سینٹر کے اندر و باہر جانکار افراد اِس اُس طرح کی باتیں کرنے لگے۔ پرویز بھی بہن کی اس حرکت پر ناخوش تھا۔ جہاں آراء کو اپنی نادانی اور فاش غلطی کا احساس بھی تب ہوا۔ جب بہت دیر ہوچکی تھی۔۔۔۔ وہ ریاض الدین کے ناجائز بچے کی ماں بننے والی تھی۔۔۔۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔۔۔۔۔ ریاض الدین پر اصلیت ظاہر کیا کردی کہ اس چاپلوس شخص کا وطیرہ ہی بدل گیا۔ گرگٹ کی صورت رنگ بدلے جہاں آراء کو آوارہ اور بدچلن کا خطاب بخشے دامن بچانے لگا۔

جہاں آراء کو ایسے لگا کہ کسی نے اس کے وجود کو کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دیا ہو۔۔۔۔۔ وہ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگی۔ پریشانی اور افراتفری کے عالم میں اس نے علی الصباح بڑی ندی کا رُخ کیا۔ وہ ندی میں کودنے والی تھی کہ کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ مڑ کر دیکھا تو سامنے اشفاق تھا۔

''اشفاق مجھے مرنے دو۔ میں زندہ رہنے کے قابل نہیں''

''نہیں جہاں آراء یقین کرلو میں تمہیں دل وجان سے چاہتا ہوں''۔ یہ اشفاق تھا۔

''اصلیت جاننے کے بعد بھی کہ میں ماں بننے والی

ہوں‘‘ جہاں آراء مری مری آواز میں کہہ سکی۔

’’ہاں! یہ اصلیت جان کے بھی‘‘ اشفاق بلا تامل کہہ گیا۔

’’محبت جہاں آراء پاک جذبے کا نام ہے جس کا تعلق روح و دل سے ہوا کرتا ہے نہ کہ جسم سے! یقین کرلو تم ہی پہلی و آخری لڑکی ہو جسے میں نے چاہا ہے‘‘۔

دونوں ایک دوسرے کو اُلفت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اپنائیت کے ماحول میں جہاں آراء کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور اشفاق نے فرطِ محبت میں اِسے گلے لگالیا۔ نہ جُدا ہونے کے لئے۔



رنج سے خُوگر

راحت سرکاری ہسپتال میں بطور نرس کام کر رہی ہے۔ قبول صورت، متوازن خدوخال، ہنس مکھ، شیرین زبان اور خلوص کی دولت سے مالا مال راحت کو اپنے فرائض خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرنے میں یدطولیٰ حاصل ہے۔ ہمدردانہ اور مُشفقانہ برتاؤ اپنانے کے باعث وہ ڈاکٹروں، طبی عملہ، مریضوں اور تیمارداروں میں ہر دِل عزیز بن چکی ہے۔ دِن ہو یا رات شہد کی مکھی کی طرح لگن کے ساتھ اپنی ڈیوٹی بجالانا راحت کا معمول بن چکا ہے۔ ستانے یا آرام کرنے کی بابت سوچنا بھی اُسے منظور نہیں۔ شوخی راحت کی فطرت میں شامل تھی۔

یہ بھی نہیں کہ راحت کی زندگی میں فقط مسرت و شادمانی نے بسیرا کر لیا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس کی ذاتی زندگی مصائب و کرب کے تھپیڑوں سے دوچار رہی ہے۔ اُسے بھی اس بے وفا سنسار نے خون کے گھونٹ پینے پر مجبور کیا ہے۔۔۔ دراصل راحت نے اپنی چھوٹی سی نگری میں بشاشت کا رنگ بھرنے کی چاہ میں اشتیاق کے پیار کا جواب محبت سے دیا تھا۔ اپنوں کی مخالفت اور جان پہچان والوں کی ناراضگی کے باوجود اُس نے اشتیاق کو رفیقِ زندگی کے طور چُن لیا۔ والدین کا اکلوتا بیٹا ہونے اور والدین کی آپسی ناچاقی کے باعث اِشتیاق لڑکپن سے ہی لااُبالی پن کا ہدف بنے آوارگی کی راہ اختیار کر گیا تھا۔۔۔ ۔۔ بیٹے کا باپ بن جانے کے بعد بھی اشتیاق کی کج روی اور بے مُروتی جاری رہی۔ الغرض شریک حیات کے ساتھ ساتھ والدین کا دِل دُکھانے میں پیش پیش رہا۔ لاکھ

سمجھانے کے بعد بھی اُس کے عیاشانہ طور طریق میں کسی طرح کی تفاوت دیکھنے کو نہ ملی۔

راحت پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا جب سُننے کو مِلا کہ اشتیاق نے فرزانہ نام کی دوشیزہ سے کورٹ میرج رچائی ہے۔

راحت کی رگِ حمیت جاگ اُٹھی۔ لڑکے کو اپنے قریب رکھنے اور زندگی کو آنے والے سیلاب سے بچانے کی خاطر کورٹ کی وساطت خُلع کی راہ اپنائے اشتیاق سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ تب سے راحت ہسپتال کے کوارٹر میں بیٹے کے ساتھ قیام پذیر ہے۔ اُس کے دل میں غموں کا سمندر چُھپا ہوا ہے لیکن کیا مجال اُس نے کسی کے سامنے اپنی کرب ناک روئیداد کا اظہار کیا ہو۔

کل رات جموں سے سرینگر آئے سیاحوں سے بھری گاڑی کا بانہال کے پاس حادثہ پیش آیا۔ زخمیوں کو ہسپتال منتقل کیا گیا۔ اُن میں بنگلور کے مسعود انور بھی تھے۔۔۔ بے حس۔۔۔ اور بے حواس سے۔۔۔

ڈاکٹر محمود کی سرکردگی میں ایک ٹیم نے مسعود کا بغور مُلاحظہ کیا اور اس نتیجے پر پہونچے کہ مسعود کی احساس و جذباتی قوت نیم مردہ پڑ چکی ہے۔ ڈاکٹر محمود نے اتنا تک بتا دیا کہ اگر جلد سے جلد اُس کے احساسات کو نہ جگایا گیا تو عین ممکن ہے کہ وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے یا پاگل پن کا شکار بن جائے۔

مسعود انور کو اسپیشل کمرہ نمبرے میں رکھا گیا۔ اور جذبات و احساسات میں جان بھرنے کی خاطر خاص طور سے راحت کا انتخاب کیا گیا۔۔۔ راحت کمرہ میں داخل ہوگئی تو مسعود بیڈ پر آنکھیں بند کئے پڑے تھے۔ اُس کا گورا گورا سا مردانہ مکھڑا کِھلا کِھلا سا لگ رہا تھا۔ ڈاکٹر محمود سے تفاصیل دریافت کرنے اور کیس فائل کا جائزہ لینے کے بعد راحت پر

یہ اصلیت واضح ہوگئی کہ مسعود کو حادثہ میں بائیں کندھے اور کن پٹی میں گہرے زخم آئے ہیں۔۔۔۔ ڈرسنگ یا انجکشن کرنے کے دوران اُسے درد کا احساس نہیں ہوتا۔ ٹیسٹ کرانے کی غرض سے زخم کے اِرد گرد کچھ گوشت کاٹ لیا گیا اور وہ بلا کسی حرکت کے پڑا رہا۔

گویا جذبات واحساسات کو حرکت میں لانے کی ذمہ داری راحت کو سونپ دی گئی۔ اور راحت حسب ہدایت ٹیم ٹام کی حالت میں دن رات کا بیشتر حصہ کمرہ نمبر ے میں گذارنے لگی۔

مُنہ ہاتھ دُھلاتی، بٹھاتی، لٹاتی، کپڑے تبدیل کراتی اور رفع حاجت میں ساتھ دیتی۔ تصویروں کے البم دِکھاتی اور کہانیاں سناتیں۔

ہفتہ بھر گذرنے کے بعد مسعود نے لبوں اور ہاتھوں کو جنبش دی۔ ایک دن راحت گلاس میں مسعود کے لئے دودھ لیکر گئی۔

''دودھ پی لیجئے'' راحت نے اُلفت بھرا انداز اپنایا۔

مسعود نے نظریں گُھمائیں اور گلاس تھامنے کی غرض سے دایاں ہاتھ آہستہ سے آگے بڑھایا۔ راحت نے اپنائیت میں اس کے ہاتھ کو تھاما۔

مسعود حیرانی کے عالم میں غرق راحت کو گُھورتا رہا۔

''آپ نے کچھ محسوس کیا''۔ راحت نے پوچھا۔

''کیا''۔۔۔۔ یہ مسعود تھا۔

''میری انگلیوں کی لمس''

ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوئی''

راحت بشاشت کے مارے ڈاکٹر محمود کو اصلیت سے کیا آگاہ کر گئی کہ وہ مارے خوشی کے اُچھل پڑے۔

''مجھے ناز ہے تم پر بیٹی''

ڈاکٹر کے یہ الفاظ سُن کر راحت کی خوشی دو چند ہوگئی۔

اس عالم میں کچھ دن اور گذرے

''لائے آج میں خود گلاس تھام لوں گا''۔ مسعود نے کہا

گلاس ہاتھ میں لئے وہ لبوں تک لے گیا

ہاتھ کانپنے لگا تو راحت نے سہارا دیا۔

''مجھے آپ کے ہاتھ کا ملائم پن محسوس ہو رہا ہے''

''راحت نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

''نہیں''! مسعود نے راحت کا ہاتھ زور سے دبانا شروع کیا۔

''آج آپ کے مخمل جیسے ہاتھ کی گرمی محسوس کر رہا ہوں،

آپ کے ایثار کو میں فراموش نہ کر پاوں گا۔''

اگلی صبح راحت کمرے میں داخل ہوگئی تو مسعود کو اپنے انتظار میں پایا۔

دوائی پلائی۔۔۔۔انجکشن کیا اور منہ ہاتھ دُھلایا۔

''اب تو تمہارے چھونے سے لگتا ہے میرے تن من میں
برقی رو دوڑ رہی ہو۔۔۔تم کتنی اچھی ہو میں بیان نہیں
کرسکتا''۔

مسعود کی پیار بھری باتیں سُن کر راحت کا دِل زور سے دھڑکنے لگا، وہ مسعود کو

چاہنے لگی۔

مسعود بھی اَب برملا راحت کے تعریفوں کے پل باندھنے لگا۔

راحت کوارٹر میں آکر نہا دھو کر کپڑے بدلنے لگی اور پھر قد آدم شیشے کے سامنے اُپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ وہ مسعود کی بابت زیادہ سے زیادہ دھیان دینے لگی۔

اگلے روز بن سنور کر ہسپتال کا رُخ کیا تو خلاف توقع مسعود کو احاطے میں کھڑا پایا۔ ڈاکٹر محمود وغیرہ بھی وہاں کھڑے تھے۔ اتنے میں مسعود کی نظر راحت پر پڑ گئی۔

''ہیلو سِسٹر راحت! میرے گھر والے کل رات دیر گئے آ گئے تھے۔ میری بیوی اور والدہ مجھے لینے آئی ہیں۔۔۔۔ ہاں تو سلمہ یہ ہے راحت جن کا ذکر میں نے تم لوگوں سے کیا تھا۔ انہوں نے بڑی لگن اور ہمدردی کے ساتھ میری خدمت بجالائی ہے میں اُن کے احسان کا بدلہ چکا نہیں سکتا۔''

یہ کہہ کر مسعود گاڑی میں بیٹھ گیا اور راحت کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اُس کے وجود کو زہریلے ناگوں نے جگہ جگہ ڈس لیا ہو۔ ہسپتال کے بجائے کوارٹر کا رُخ کر گئی اور اضطرابی کیفیت میں اپنی برگشتہ بختی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔



جانکاہ صدمہ

اشرف اور جوگیندر شہر کے کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھنے والے گہرے دوست اور ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہنے والے ہیں۔ دونوں متمول گھرانوں کے تعلقات برسوں پر محیط ہیں۔۔۔۔ اشرف کے دادا سیٹھ سلیمان شاہ اور جوگیندر کے دادا سردار پرجیت سنگھ دونوں فارسٹر کے طور کام کرتے تھے۔ اُن کے بعد اشرف کے والد سیٹھ جمال شاہ اور جوگیندر سنگھ کے پِتا سردار کرتار سنگھ نے دوستی کو قائم رکھتے ہوئے ٹھیکہ داری کے پیشے کو اپنایا۔ دونوں گھرانوں کے اپنائیت و پریم سے لبریز ماحول کے شہر بھر میں چرچے تھے۔ ۔۔۔آج کل اشرف قالین کا بیوپار کر رہا ہے اور جوگیندر نے فرنیچر تیار کرنے کا کارخانہ کھول رکھا ہے۔

اشرف اور جوگیندر ماں باپ کی اکلوتی اولاد نرینہ ہونے کے باعث ناز و نعم میں پلے، پڑھائی کی جانب زیادہ دھیان نہ دے کر لا اُبالی پن کا ہدف بنے ناتراشے قلم کی صورت ہر طرح کی قباحت کو اپناتے رہے۔ اشرف کی بہن ذکیہ اور جوگیندر کی بہن رانو بھی بھائیوں کے نقش قدم پر چل کر ایک دوسرے کی دانت کاٹی روٹی کھالیتے۔ ایک ہی کالج میں زیر تعلیم تھیں اور دونوں میں گہری دوستی تھی۔

اشرف اور جوگیندر دونوں جبلتاً حُسن پرست ہیں۔ ہر خوبصورت چیز سے اُنکا لگاؤ

رہا۔اپنے ذاتی کمروں کو انہوں نے ایک سے ایک خوبصورت پینٹنگ، مورتی یا جانوروں کی تصویروں سے سجا رکھا ہے۔ اِسی طرح خوبصورت اور حسین لڑکیوں سے رابطہ قایم کر کے اُن کے جذبات سے کھلواڑ کرنا اُن کا محبوب مشغلہ ہے۔ بے حساب دولت کے ہوتے ہوئے شراب پینا، جُوا کھیلنا، کلب جانا اور آزاد طبیعتی کا مظاہرہ کرنا اُن کا معمول بن چکا ہے۔

اشرف نے نئے تعمیر شدہ گُل لالہ باغ کی بابت سنا تھا۔ جائے مخصوص پر جوگیندر کو نہ پا کر ٹکٹ لیکر وہ باغ کے اندر چلا گیا۔ مہین کپڑوں میں ملبوس دُوشیزہ کو دیکھے عادت سے مجبور فقرہ کسا:

''سُنائے: کیا لوگی رات کا''

دوشیزہ نے گھبراتے ہوئے اپنے سینے کو برائے نام ڈوپٹے سے ڈھانپا اور نفرت آمیز نگاہوں سے اشرف کو گھورتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔لیکن اشرف سے بچ پانا محال۔ بے شرموں کی طرح لپک کر دوشیزہ کے مقابل قدم ملائے چلنے لگا۔ ابھی کچھ دُور ہی چلا تھا کہ جوگیندر کی آواز نے چونکا دیا۔

''ارے اشرف: کیا معاملہ ہے بھائی''

سامنے فٹ پاتھ پر جوگیندر کھڑا تھا۔

اشرف نے دوشیزہ کا تعاقب کرنا چھوڑ دیا۔

''کیوں جگو: تم وقت پر نہیں آئے، خیریت ہے''

''ارے یار پاپا جی نے پکڑ لیا تھا۔ رانو کی شادی کی بات چلی تھی۔ ایک مناسب گھرانے سے رشتہ آیا ہے۔''

دونوں تقریباً ہر شام اِکھٹے سیر کو نکلتے، کبھی گگری بل، نہرو پارک، چار چناری، اقبال پارک یا پھر نمائش اور آتی جاتی قبول صورت لڑکیوں پر اِس اُس طرح کے فقرے کسنا۔۔۔ بھنورے کی طرح مختلف قسم کے پھولوں کا رس چوسنا اُن کا دین وایمان تھا۔

''ارے آج کی بابت کیا سوچا ہے؟'' اشرف نے لقمہ دیا۔

''آج کا پروگرام نہایت ہی دل چسپ ہے'' یہ جوگیندر تھا۔

گاڑی میں بیٹھ نگین باغ کی طرف چل پڑے اور ''کائنات'' نام کے بڑے عالیشان ہاوس بوٹ میں داخل ہو گئے۔ ایک موٹی سی نیم عریاں خاتون نے استقبال کیا۔

''یہ دل نشین ہے'' جوگیندر نے تعارف کرایا۔

''اندر کیبن میں دل نشین کی چھوٹی بہن دل آرا تمہارے

انتظار میں ہے۔ اِس بازار میں نئی ہے جاؤ مزے لوٹو''

شراب کے دو پگ حلق پر انڈیلنے کے بعد اشرف کیبن کے اندر گیا۔ دل آرا اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ سامنے سجے سجائے پلنگ پر بیٹھی تھی۔۔۔ بلا کی حسین۔۔۔ اشرف نے سراپا کا جائزہ لیا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں آپ'' دل آرا نے پوچھا

''دیکھتا ہوں تم حوازادی ہو یا پری ذات۔۔۔ توبہ!

اس قدر خوبصورت۔۔ نظر نہیں ٹھہرتی۔

''چھوڑیئے۔۔۔ بنائیے مت''

اشرف نے حُسن کی تاب نہ لا کر کوٹ نکالا اور دل آرا کی طرف بڑھنے لگا۔ اتنے میں بغل والے ہاوس بوٹ کے کیبن سے ہنسی کا فوارا پھوٹ پڑا۔ ساتھ ہی ایک مانوس

آواز نے اشرف کی سماعت کے پردے ہلا کر رکھ دیئے۔۔۔۔۔۔سرگوشیاں اُبھریں۔

اُشرف کے تحت الشعور میں عجیب طرح کی ہلچل مچ گئی۔ اُس کا سارا نشہ کافور ہوا۔

نیم عریاں دل آرا سے آنکھیں چُرائے کوٹ پہن لیا۔ بٹوہ نکال کے دل آرا کے پلنگ پر چھوڑ ہاؤس بوٹ سے باہر آیا۔

''اُنگلیاں موبائیل پر تھرکنے لگیں

''ماں ذرا ذکیہ کو دینا''

''وہ رانو کے گھر گئی ہے دیر سے لوٹے گی''

''اچھا ماں! میں فارم ہاؤس میں رات گذاروں گا، فکر نہ کرنا۔۔''

دل آرا ڈھنگ کے کپڑے، پہنے باہر آ گئی لیکن اشرف چلا گیا تھا۔ وہ دیدی کی کیبن میں گئی جہاں جوگیندر کی آغوش میں وہ جذبات کی دنیا میں غرق تھی۔

''دیدی وہ چلا گیا۔ اُس نے مجھے چُھوا تک نہیں۔ اور روپیوں سے بھرا بٹوہ بھی چھوڑ گیا۔''

یہ سُننا تھا کہ جوگیندر کا سارا نشہ اُتر گیا۔ وہ حیران کہ اِس قدر حسین لڑکی کو کیسے اشرف نے صحیح سلامت چھوڑ دیا۔

جوگیندر مخصوص جگہوں پر اشرف کو ڈھونڈنے گیا۔ ہوٹل، کلب کہیں نہیں تھا۔ پریشانی کے عالم میں اشرف کے گھر فون کیا تو ماں جی نے بتایا کہ فارم ہاؤس چلا گیا ہے۔ رات کاٹ کے جوگیندر صبح سویرے سیدھے فارم ہاؤس چلا گیا۔ چوکیدار ست پال نے بتایا کہ ''چھوٹے سرکار رات دیر گئے آ گئے۔۔۔ کچھ کھایا پیا نہیں۔۔۔ اور سو گئے۔ ابھی تک

نہیں اُٹھے۔"

جب کھٹکھٹانے سے دروازہ نہ کھلا تو جوگیندر نے ست پال کی مدد سے دروازہ توڑ دیا۔

اشرف اُوندھے منہ فرش پر پڑا تھا۔ جوگیندر نے اُٹھانے کی سعی کی لیکن روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔

افسوس حوا زادیوں کی عزت و ناموس کی چادروں کو تار تار کرنے والا عیاش فطرت اپنے گھرانے کی دہلیز پر سلگتی چنگاری کی تپش تک برداشت نہ کر سکا۔



اعتبار

کاجل حد درجہ اُداس اور افسردہ ہے۔

اُسے غم و کرب نے مکمل طور اپنے چنگل میں لے رکھا ہے۔ کہاں بات بات پر مذاق کرنے والی اور سدا مُسکرانے والی کاجل اور کہاں یہ آج کی پژمردہ کلی۔۔۔ اُسے کسی طرح کا قرار حاصل نہیں۔۔۔۔ اور پھر غم غلط کرنے کی نیت سے اُس نے مستی بھری بوتل کا سہارا لیا۔ شراب کی کچھ مقدار حلق کے اندر کیا گئی کہ کاجل کی ہستی ڈگمگانے لگی۔ اُس کے ذہن میں افراتفری سے لبریز سوتے پُھوٹنے لگے۔ گئی گزری یادیں اُبھر کر اُسے بے قرار کرنے لگیں۔۔۔ کاجل آرام کرسی پر براجمان سامنے تپائی پر پڑے ''پیپر ویٹ'' کو انگلیوں سے گُھمانے لگی۔ کانچ کے ''پیپر ویٹ'' پر بنی کچھ جانوروں کی تصویریں گھمانے سے ایک دوسرے سے غلط ملط ہوگئیں۔۔۔۔۔ ساتھ ہی کاجل کے روبرو ماضی کے واقعات ایک ایک کر کے منڈلانے لگے۔

کاجل سوچنے لگی، نہ جانے دلیپ کہاں ہوگا۔۔۔ وہ زندہ بھی ہے یا۔۔۔ اُف! کیوں میں نے دلیپ کا دِل توڑا۔۔۔ اُس کے ارمانوں کا خون کر دیا۔۔۔۔ میں نے اُس کے پیار کو خاطر میں نہ لائے اچھا نہیں کیا۔۔۔ آخر کیوں میں نے اُس کی چاہت کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔۔۔ اب میری زندگی ایک عذابِ مُسلسل سے کم نہیں!

دراصل کاجل زندگی میں دھوکے پر دھوکہ کھا گئی تھی۔ اِس لئے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر دلیپ کی بے لوث اُلفت کو خاطر میں نہ لا سکی۔ محبت کی آڑ میں اُس نے اِس قدر چوٹیں کھائی تھیں کہ مرد ذات سے ہی اُسے نفرت ہوگئی تھی۔ اُسے سارے مرد دھوکہ باز، فریبی اور دغاباز جان پڑتے تھے۔ وہ کسی ایک پر اعتبار نہیں کر پاتی۔

کاجل نے جس کے آگے دست شفقت دراز کیا اُسی نے حیوانیت کی راہ پر گامزن اُس کے ارمانوں سے کھیلنا اپنا فرض جان لیا۔۔۔۔ ہوس پرستی کے دلدادہ اکثر مردوں نے اُسے اپنائیت و ہمدردی کے نام پر ضلالت کی آغوش میں دے پھینکا۔

کاجل ایک شریف، خاندانی اور تہذیب یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ کورے اور سفید کاغذ کی طرح اُس کی چڑھتی جوانی بے داغ تھی۔ ناگہانی حوادث میں ماں باپ کا ساتھ چھوٹنے کے بعد کاجل کی ہستی ایک ڈور کٹی پتنگ کی سی تھی۔ جو بے اِرادہ اِدھر اُدھر بھٹکتی رہتی۔۔۔۔ کسی ایک نے اُس کی دست گیری نہیں کی۔۔۔۔ بلکہ زمانے کے تھپیڑے کھائے کاجل نے شرافت کی نگری کو خیر باد کہا۔۔۔۔ اور پھر رُوح و دِل کی چاہتوں کے برعکس ہوس پرست مردوں نے اُسے ذلیل پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

۔۔۔۔ راکیش ایک نڈر اور بے باک جوان تھا۔ وہ کاجل کی زندگی میں طوفان کی طرح داخل ہوا۔

"کاجل! میں تمہیں دِل و جان سے چاہتا ہوں۔ یقین
کرلو میں نے تم سے پہلے کسی ایک لڑکی طرف آنکھ اُٹھا کر
بھی نہیں دیکھا ہے۔ تم پہلی لڑکی ہو جس کے لئے میرے
دل میں محبت کی کلی پھوٹ پڑی ہے۔ میرا خیال ہے

تمہیں بھگوان نے میری خاطر اس دنیا میں بھیجا ہے۔''

''جذبات میں بہہ کر بے سر پیر کی باتیں نہ کرو۔

حالات کا بھر پور جائزہ لو اور گھر والوں کو اعتماد میں لو۔''

کاجل نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ لیکن ایک تجربہ کار شکاری کی طرح راکیش نے سبز باغ دکھائے کاجل کو اپنے دامِ فریب میں پھانس دیا۔ آہستہ آہستہ راکیش کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر کاجل بھی اُسے ٹوٹ کر چاہنے لگی۔ غرض دونوں ازدواجی رشتے میں بندھ گئے۔

جلد ہی کاجل پر یہ اصلیت واضح ہو کر رہ گئی کہ راکیش ایک امیر گھرانے کا بگڑا شہزادہ ہے لاابالی پن کا دِلدادہ۔۔۔ وہ جان گئی کہ راکیش ایک بھنورا ہے۔ ایک پھول کا رس چُوس کے دوسرے پُھول کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ کاجل کو یہ احساس ہوا مگر بہت دیر کے بعد جبکہ وہ پوری طرح لُٹ چکی تھی۔ وہ جس بوجھ کو کوکھ میں لئے پھر رہی تھی راکیش کی دغابازی کے بعد کسی آشنا نے اُس کا ساتھ نہیں دیا۔۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اِس لمبی چوڑی دنیا میں تن تنہا رہ گئی۔

اُس کا کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔

کوئی درد بانٹنے والا نہیں تھا۔

غرض محبت کے بدلے اُسے خون کے گھونٹ پینے پڑے۔

اِسی بے بسی و بے کسی کے عالم میں کاجل کی زندگی میں ایک اور بھنورا دلیپ کے نام سے نمودار ہوا۔

''میں رُوح کی گہرائیوں سے کاجل تمہیں چاہتا ہوں۔

کاش تمہیں میری پاکیزہ، بے لوث اور پُر خلوص محبت پر یقین آتا۔۔۔''

کاجل کو ایسا لگا کہ جیسے بچھوؤں نے اُسے جگہ جگہ کاٹ کھایا ہو۔ غضب ناک لہجہ میں للکاری:

''پیار اور محبت تو مردوں کے لئے ایک مشغلہ سے کم نہیں۔ چاہت کی آڑ میں تم لوگ دراصل ہوس پرستی کی دیوی کی پُوجا کرتے رہتے ہو۔ طرح طرح کے حربے اپنائے مرد لوگ عورتوں کو چاہنے لگتے ہیں اور پھر اُن کے جذبات و احساسات سے کھیلے اپنے سے یُوں الگ کردیتے ہیں جیسے مکھن سے بال''۔

''کاجل مجھ پر بھروسہ کرو، میں اُن مردوں میں نہیں جو خواتین کو عیش و عشرت کا کھلونا تصور کئے اُن کی ناموس کا سودا کرتے ہیں''۔

''یقین کرلوں: وہ بھی ایک مرد پر۔۔۔۔ یقین کرلو کہ تم مجھے دل و جان سے چاہتے ہو۔ ایک بات کا جواب دوگے دلیپ''

''کون سی بات''

''تم میری بابت کیا رائے رکھتے ہو، یعنی تمہاری نگاہوں میں میری حیثیت کیا ہے'' یہ کاجل تھی۔

''تم میری نگاہوں میں بہت ہی عظیم ہستی ہو کاجل۔

تم دیوی کے سمان ہو۔۔۔اور یہ بھی سچ کہ میں تیرے بغیر

زندہ نہیں رہ سکتا۔۔۔تم۔۔۔۔

''ہاہاہاہا''۔۔۔کاجل بات کاٹتے بولی

''تم بھی مجھے بے وقوف بنانے لگے ہو۔۔۔سب

مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔راکیش نے بھی میری تعریف

میں یہی الفاظ دھرائے تھے۔سب مرد ایک جیسے ہوتے

ہیں۔آستین کے سانپ''

اب کے دلیپ گلوگیر آواز میں برجستہ کہہ گیا۔

''میں پاگل ہوں یا دیوانہ جو تمہیں میری باتوں پر

یقین نہیں آتا۔تم راکیش کی طرح مجھے بھی بے وفا اور دغا

باز خیال کرتی ہو۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں،

کاجل مجھے بے موت مت مارو''۔

''دلیپ خدا کے لئے مجھے بھول جاؤ۔۔۔۔میری

خوبصورتی پر مت جاؤ۔ یہ ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے،

میں تو اِس سماج کی گھناونی تصویر ہوں۔اصلیت جان

کے بھی تم مجھے اپنانے کی سوچ رہے ہو''۔

''میں تمہاری مانگ میں سیندور بھرنا چاہتا ہوں اور

تمہارے بچے کی شناخت بننا چاہتا ہوں۔۔۔''

''نہیں دلیپ'' کاجل بات کاٹتے گویا ہوئی۔

”میں اب دھوکہ نہیں کھانا چاہتی۔ میری کھوکھلی اور
بدنام زندگی میں اب رکھا ہی کیا ہے۔۔۔۔ چلے جاؤ
یہاں سے۔۔۔سب خودغرض ہیں۔۔۔۔“
کاجل پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔
دلیپ ایک نئے جذبہ کے ساتھ آگے بڑھا۔
” کاجل میں نے تمہارا دِل دُکھایا۔۔۔ تمہارے
زخموں کو کُریدا۔۔۔ مجھے معاف کردو۔۔۔۔ پر یقین کرلو
تم میری نظروں میں پوتر دیوی ہو۔ اچھا کاجل
میں جارہا ہوں البتہ مرتے دم تک تمہارا انتظار رہے گا۔“
جواب میں کاجل کی آبدیدہ نظریں اُٹھیں اور جُھک گئیں۔
”بھگوان تمہیں ہر حال میں خوش رکھے“ الوداع
یہ کہتے دلیپ کاجل کی نظروں سے اُوجھل ہوگیا۔۔۔ اور اُس کے چلے جانے
کے بعد کاجل اپنی تقدیر پر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔
دلیپ جاچکا تھا۔ البتہ ننگی زمین پر اُس کے پاؤں کے نشان صاف دکھائے دے
رہے تھے۔۔۔ کاجل جُھکی اور نہ جانے کس جذبے کے تحت نشان والی مٹی مٹھی میں لی۔
اتنے میں بادل گرجے، بجلی چمکی اور تیز ہوا کا جھونکا آیا کہ کھڑکی کے پٹ زور
سے بجنے لگے۔
خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا
اب کاجل تھی اور خالی کمرہ اور سامنے تپائی پر پڑا کانچ کا پیپرویٹ۔

دلیپ کے آخری الفاظ اُس کے کانوں سے ٹکرائے

''کاجل پیار کے اِس سفر میں مجھے ثابت قدم پاؤ گی۔۔۔میں دھوکہ باز نہیں۔

اِس کے بعد طرح طرح کے خیالات اُس کے ذہن میں اُبھرے۔۔۔یاسیت واُداسی سے لبریز خیالات۔

کاجل نے اَدھ بھری بوتل کو گلاس میں انڈیل کے پینا شروع کیا تاکہ ماضی کی تلخ یادوں کا سِلسلہ ختم ہوجائے۔



اتفاق کی بات

کچھ وقت امین آباد پارک میں گذارنے کے بعد الطاف سڑک پر آگیا۔ سامنے فُٹ پاتھ پر مختلف چیزیں فروخت کرنے والوں پر سرسری نظر دوڑائی اور پھر پاس ہی چائے خانے میں گھس گیا۔

وہاں اور بھی لوگ بیٹھے تھے اور کچھ طرح طرح کی باتیں کرنے میں مشغول۔۔۔ الطاف چُپ چاپ جائزہ لینے لگا اور پھر ایک کنارے کی میز کی چاروں طرف پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

چائے خانہ کے ایک لونڈے کو اُنگلی کے اشارے سے بُلا کر ایک کپ چائے لانے کے لئے کہدیا۔

چائے آگئی، اس کے ساتھ ہی ایک اُدھیڑ عُمر کا خوش باش آدمی دُوسری طرف سے آیا اور الطاف کے روبرو کُرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا اور سگریٹ پیتا رہا۔ پھر تکلفانہ انداز اپنائے پوچھا۔

''شاید آپ پہلی بار اِس شہر میں آئے ہیں''

''آپ نے کیسے اندازہ لگایا کہ میں اجنبی ہوں'' الطاف بے تامل کہہ گیا۔

''ارے جناب۔ خوش باش آدمی بولا

''میں دیکھ رہا ہوں آپ کچھ دنوں سے اِس بازار میں
چکر لگا رہے ہیں۔ بھلا یہاں رکھا ہی کیا ہے بھولے بھٹکے
کوئی کوئی چیز آ جاتی ہے اور پھر اُڑ کر کہیں چلی جاتی ہے''۔
''آپ کا اندازہ ٹھیک ہے۔ میں اجنبی ہوں۔ میں
نے اس بازار و ملحقہ بستی کا بار بار چکر لگایا لیکن مجھے
میرے مطلب کی چیز نہیں ملی''۔
''میں سرکار کی خدمت کرسکتا ہوں''۔
خوش باش آدمی نے اَدھ جلے سگریٹ کو دُور سڑک پر پھینکتے ہوئے کہا۔
''آپ کی تعریف'' یہ الطاف تھا۔
''جناب تعریف تو خدائے برتر کی ہے جس نے یہ دنیا
تشکیل دی۔ ویسے مجھے دِلدار خان کہتے ہیں''۔
''میرا نام الطاف احمد ہے۔ رامپور کا رہنے والا ہوں۔ کچھ دن قیام رہے گا۔۔۔
آپ کا کیا شغل ہے''
''ارے جناب! آپ لوگوں کے سہارے جیتا ہوں،
خدمت بجالاتا ہوں اسی طرح گذارے کے لئے کچھ رقم
مل جاتی ہے''۔
دِلدار خان کی باتیں سُن کر الطاف گہری سوچ میں پڑ گیا۔ چائے ختم ہوگئی تھی۔
الطاف نے دلدار خان کی جانب سگریٹ بڑھایا۔ دونوں نے سگریٹ سُلگائے
کونٹر کے پاس جاکے الطاف نے چائے کے دام چکائے اور دونوں چائے خانے سے باہر

آ گئے۔

سٹرک کے نکڑ پر رکشا والا کھڑا تھا

دِلدار نے اُسے اِشارے سے اپنی طرف بُلایا۔

سلیک علیک کے بعد دونوں رکشہ پر سوار ہو گئے۔

''کہاں چلنا ہے خان صاحب''

''لاجپت نگر چلو'' دلدار نے سنجیدہ ہو کے کہا۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے اور سگریٹ کا دھواں خاموش فضا میں بکھیر تے رہے۔

قریباً آدھ گھنٹے کے بعد رکشہ ایک چوراہے پر پہونچا۔

''اب کدِھر چلوں صاحب''

''بس سیدھے چلے چلو''

دلدار خان نے انگلی کے اِشارے سے بتاتے ہوئے کہا

''وہ جو دائیں جانب سیاہ گیٹ والا بنگلہ نظر آرہا ہے وہیں پر روک دینا''۔

رکشہ کے رُکتے ہی دونوں اُتر پڑے۔ دلدار خان نے کرایہ چکایا اور پھر بنگلے میں گُھس گئے۔

مرکزی دروازہ سے ایک وسیع وعریض سجے سجائے کمرے میں پہونچ کر الطاف اچھبا میں پڑ گیا۔

دِلدار نے الطاف کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اندرونی زینہ چڑھتا ہوا نظروں سے اُوجھل ہو گیا۔

الطاف نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا ۔۔۔ نگاہیں چاروں سمت طواف

کرنے لگیں۔۔۔۔ یکا یک اُس کی نظریں سامنے دیوار پر ٹنگی ایک تصویر پر جم کر رہ گئیں۔۔۔۔اُس کی صورت کچھ کچھ حسینہ سے ملتی تھی۔۔۔۔۔حسینہ کا خیال ذہنی وُسعتوں میں اُبھرتے ہی پرانی یادوں نے اُس کے دل میں کروٹیں لیں۔۔۔۔وہ اُن رنگین یادوں میں کھو گیا۔۔۔۔۔

۔۔۔۔برسوں قبل جب وہ پہلی بار محبوب نگر اپنی خالہ کے ہاں گیا تھا خالہ زاد بہن رفیقہ کی شادی تھی۔۔۔ایک ہنگامہ تھا۔۔۔وہاں اُسے حسینہ سے ملاقات ہوئی تھی۔حسینہ خالہ کے مکان کے بغل میں رہتی تھی۔خدائے برحق نے اُسے اتنا حُسن بخشا تھا کہ الطاف دیکھتا رہ گیا۔۔۔واپسی سے پہلے الطاف نے حسینہ کو اپنانے کی بات اپنی خالہ سے کہہ دی تھی۔اور پھر الطاف گھر لوٹنے کے قریب ہفتہ بعد حسینہ کے یہاں ڈاکہ پڑا۔ڈاکو باپ کی ساری دولت کے ساتھ حسینہ کو بھی اُٹھا کر لے گئے۔خالہ کے خط سے جب اِس حادثہ کی خبر ملی تھی تو الطاف کو قلبی دُکھ ہوا۔۔۔۔۔

اُسی وقت زینہ پر سے کسی کے اترنے کی آواز آئی۔الطاف نے جلدی سے اپنی آنسوؤں سے بھری آنکھوں کو رُومال سے صاف کیا اور زینہ کی طرف دیکھنے لگا۔

کافی دیر نظریں جمائے رکھنے کے بعد جب کوئی نظر نہ آیا تو الطاف نے وہم سمجھ کر اُدھر سے نظریں ہٹائیں اور پھر خیالوں میں کھو گیا۔

''پتہ نہیں اب حسینہ کس حال میں ہوگی۔ڈاکوؤں
نے اُسے زندہ بھی چھوڑا ہوگا کہ نہیں۔۔۔۔۔۔''

یہ خیال آتے ہی اُس کا سر چکرانے لگا۔

کسی کے تیزی سے زینہ اُترنے کی آواز گونجی۔

الطاف بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا

سامنے دِلدار خان ہنس رہا تھا۔

''الطاف صاحب معاف کرنا کچھ دیر لگی۔ یہ جگہ ہی ایسی ہے۔۔۔سب کچھ بُھول کے اِنتظار کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔''

''دلدار خان کام کی بات کرو''۔الطاف بات کاٹتے کہہ گیا۔

''کام ہی کی بات کر رہا ہوں۔بس آ ہی رہی ہوگی مالکن''

''مالکن۔''الطاف کو تعجب ہوا ''مالکن سے تمہارا مطلب؟''

''اس بنگلہ کی مالکن کے بارے میں کہہ رہا ہوں''۔۔۔۔۔۔گذشتہ پندراں برسوں سے اس بنگلہ و مالکن سے وابستہ ہوں۔۔۔۔آج تک کسی کو نہیں معلوم کہ یہ بنگلہ بھی ایک مہذب قحبہ خانہ ہے۔گرچہ مالکن کی جوانی کب کی دم توڑ چکی ہے۔پھر بھی اُس کی رعنائی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔اُس کی ہر ادا میں شرافت اور باتوں میں امرت نے بسیرا کرر کھا ہے۔۔۔۔ایک شریف بیوہ ہے اور میں اِس کا بھائی ہوں۔''

یہ کہہ کے دلدار خان کی آنکھیں بھر آئیں

ٹھیک اُس وقت ایک ادھیڑ عمر کی سفید پوش خاتون زینہ سے نیچے اُتری اور آ کر الطاف کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

چونک کر اُس نے عورت کی طرف دیکھا۔۔۔اور دیکھتا ہی رہ گیا

''کیا بات ہے الطاف بھائی'' دلدار خان نے جھنجھوڑا

''حسینہ'' الطاف زور سے چیخ پڑا۔

ساتھ ہی حسینہ سے لپٹ کر کہنے لگا

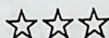
''میں برسوں سے تمہاری تلاش میں ہوں۔ تم آج

بھی میرے لئے وہی حسینہ ہو جو برسوں پہلے تھی۔۔۔۔

آؤ میری ظلمت بھری زیست میں رعنائی بھر دے۔''

جواب میں حسینہ کی ہچکیاں بندھ گئیں

اور دلدار خان پاس میں کھڑا ہکا بکا دونوں کو دیکھتا رہا۔



خلاصی

سورج آنگن میں اپنی نُورانی شعاعیں بکھیر رہا تھا۔ چڑیاں چہچہانے لگیں تھیں۔ البتہ برتن دھونے پانی بھرنے یا جھاڑو دینے کی آواز خلاف توقع نہیں آ رہی تھی۔ پچھلے قریباً دس برسوں میں یہ پہلا موقع تھا جب عاصفہ صُبح مقررہ وقت پر نہیں جاگی تھی۔ ویسے عاصفہ علی الصبح اذان کی آواز کے ساتھ ہی جاگ جاتی تھی۔ آج بھی اُس نے حسب سابقہ اُٹھنے کی کوشش کی لیکن بستر سے اُٹھتے ہی اُس کے پاؤں ڈگمگانے لگے۔ سارے بدن میں کہالت اور سُستی سمانے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے عاصفہ کٹی شاخ کی طرح بستر پر گر پڑی۔

ممانی جان کو آج سویرے ہی دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔

''یہ عاصفہ کی بچی اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔ سورج سر پر آ چکا ہے اور شہزادی کی بچی اُٹھنے کا نام نہیں لیتی۔ جنم جلی کہیں کی۔ اس منحوس کو اتنا بھی احساس نہیں کہ ناشتہ وقت پر تیار نہ ہونے سے نعیمہ کو کوچنگ جانے میں دیر ہو جائے گی''۔

عاصفہ کا سارا جسم مانو ٹوٹ چکا تھا۔ ممانی کی جلی کٹی باتیں سُن کر اُس نے دوبارہ بستر سے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن دفعتاً آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور چکرا کے گر پڑی۔

ممانی جان کے چیخنے چلانے کے بعد ماموں جان کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگے۔

''کوئی قیامت آجائے گی اگر آج اپنے ہی ہاتھوں

سے ناشتہ تیار کرلوگی۔ تمہیں تو ہر وقت بے چاری کو گالیاں

دینے سے مطلب ہے۔ ہر وقت گالی گلوچ سے کام لینا تم

نے اپنا وطیرہ بنالیا ہے۔ محلے والوں کے سامنے تم نے میرا

سر نیچا کر دیا ہے۔ روز محشر میں اپنی بہن کو کیا مُنہ دکھاؤں

گا۔ عاصفہ اب بچی نہیں رہی ہے۔ اب تو خدارا اپنی بے

جا حرکتوں سے باز آجاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ اُس کی طبیعت

واقعی خراب ہو۔ اُس کا حال جاننے کے بجائے خوامخواہ

بکتی رہتی ہو۔"

یہ کہتے ماموں سجاد ڈار کمرے میں گھسا۔ عاصفہ کو بستر پر روتے پایا۔ بُخار کی شدت سے تپتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ چونک پڑا۔

"بیٹی عاصفہ! تمہیں تو تیز بخار ہے۔ تم کتنا کچھ

برداشت کرتی ہو۔ بیٹی تمہارا یہ صبر وضبط ایک دن ضرور

رنگ لائے گا۔۔۔۔ میں ڈاکٹر کو بُلا لاتا ہوں"۔

ماموں کے چلے جانے کے بعد عاصفہ کو یقین تھا کہ اب حال پوچھنے کی خاطر ممانی جان یا نعیمہ بہن آجائیگی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔۔۔ اتنے میں گئے گذرے واقعات و احساسات عاصفہ کی دماغی وسعتوں میں اُبھرنے لگے۔۔۔ وہ سوچوں کی دنیا میں کھوگئی۔

"ممانی جان غلط کیا کہتی ہے وہ ٹھیک ہی کہتی ہے کہ

میں جنم جلی، منحوس اور بد بخت ہوں۔ میں ہی اپنے ماں

باپ کی موت کا سبب بنی۔ زلزلہ آیا۔ ساری پہاڑی بستی

تباہ و برباد ہوگئی ۔ میں اندر کوٹھری میں پھنس گئی تھی۔

والدین چاہتے تو مجھے چھوڑ کر اپنی جان بچا سکتے تھے۔

لیکن اُنہوں نے ایسا نہیں کیا۔ مجھ بد نصیب کو بچانے کی

کوشش میں کوٹھے کا سارا ملبہ نیچے گر آیا اور وہ دونوں اُس

میں دب کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

ساری بستی ماتم کدہ بنی تھی۔ ہر طرف چیخ و پکار کی دِل خراش آوازیں اور لاشوں کے انبار بے بسی کے عالم میں والدین کی دائمی جُدائی پر میں زار و قطار رُو رہی تھی۔ اِسی عالم میں ماموں جان نے مجھے اپنے ساتھ گھر لایا۔۔۔ میں تیسری جماعت میں پڑھتی تھی۔ نعیمہ تب دُوسری جماعت کی طالبہ تھی۔ ماموں نے چاہا میں بھی اسکول میں داخلہ لوں۔ لیکن ممانی کو یہ تجویز ایک آنکھ نہ بھائی۔ ممانی تُرش مزاج کی تھی اور ماموں جان بھی اُس کا سامنا مردوں کی طرح نہ کر پاتے تھے۔ بلکہ دب کر رہتے تھے۔ میرے ہاتھ سے بستہ چھین کر چلائی:۔

" تمہارے ماں باپ دولت کے انبار نہیں چھوڑ گئے

ہیں کہ تمہاری پرورش بھی کریں اور پڑھائیں بھی۔ کان

کھول کر سُن لو یہ باورچی خانہ ہی تیرا اسکول ہے اور یہ

برتن و جھاڑو تیرے کھلونے۔"

آیئے ڈاکٹر صاحب! بچی بخار سے تپ رہی ہے"

ماموں سجاد ڈار کی آواز نے عاصفہ کو چونکا دیا۔ خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اب وہ تھی۔ کھردرا بستر اور سامنے ڈاکٹر و ماموں جان۔ ڈاکٹر نے ملاحظہ کیا۔

"اِسے تو تیز بخار ہے۔ سرد پانی کی پٹیاں سر پر رکھ دیجئے
اور یہ دوائی دو دو گھنٹے بعد ایک ٹکیہ اور دو چمچ مکسچر۔۔۔ کھانے کو
ڈبل روٹی اور دُودھ دیجئے۔ اِسے آرام کی ضرورت ہے۔ میں
شام کو پھر دیکھنے آؤں گا۔

"ڈاکٹر صاحب یہ جنم جلی تو بیماری کا ڈھونگ رچا رہی ہے۔
دراصل یہ کام چور ہے بس بیماری کا بہانہ بنا کر بیٹھتی ہے۔"

ممانی عابدہ سے برداشت نہ ہوا اور دل کا غبار نکال کے دالان کا رُخ کر گئی۔

سجاد ڈار ڈاکٹر صاحب کے ساتھ باہر آیا۔ تو ڈاکٹر علوی نے پوچھ لیا۔

"کیا یہ اس گھر کی نوکرانی ہے؟"

"نہیں ڈاکٹر صاحب! یہ بدنصیب تو میری بھانجی
ہے۔ اس کے والدین زلزلہ میں وفات پا گئے۔ افسوس
اِس بات کا ہے کہ میری بیوی نے اُسے اپنا نہیں سمجھا بلکہ
نوکرانی سے بھی بدتر سلوک روا رکھا"۔

ڈاکٹر علوی کا کلنک پاس ہی بستی میں تھا اور وہ اپنی ماں کے ساتھ کرایہ کے فلیٹ میں رہتا تھا۔ والد انجینئر کمیل احمد ملازمت کے سلسلے میں جموں میں قیام پذیر تھے۔ ڈاکٹر علوی کو عاصفہ کی حالت پر سخت افسوس ہوا۔ شام کو وہ از خود اُسے دیکھنے چلا گیا۔ اور طاقت کی دوائیاں بھی اپنے ساتھ لے آیا۔ عاصفہ بھی شفقت بھری نظروں سے ڈاکٹر علوی کو گھورنے لگی۔ از راہِ ہمدردی ڈاکٹر عاصفہ کے پاس بیٹھا اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں اُس کا دِل بہلانے لگا۔ اور جب عابدہ کو علم ہوا کہ ڈاکٹر علوی کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ وہ

نعیمہ کو کسی نہ کسی بہانے اُس کے کلنک بھیجتی رہی۔ اور پھر سجاد ڈار سے بھی بات چھیڑی کہ اپنی نعیمہ بیٹی اب بی اے کا امتحان دے رہی ہے کیوں نہ اُس کی شادی کی بات ڈاکٹر سے کی جائے۔ سجاد ڈار نے بات اَن سُنی کر دی کیونکہ وہ بھانپ چکے تھے کہ ڈاکٹر اندر ہی اندر عاصفہ کو چاہنے لگا ہے۔

جب بھی ڈاکٹر علوی آ جاتے تو عابدہ اپنی بیٹی نعیمہ کو ہدایت دیتی کہ اُس کے پاس زیادہ وقت اِس اُس بہانے گذارا کرے۔ ساتھ ہی عاصفہ کو کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھتی۔

''آج شام میری ماں عاصفہ کو دیکھنے آئے گی''۔

ایک روز ڈاکٹر علوی نے سجاد ڈار کو شرماتے ہوئے کہہ دیا۔ اور اُس نے کچھ بسکٹ اور ڈرائی فروٹ خرید کر لائے۔ عابدہ کو ڈاکٹر علوی کی ماں کے آ جانے کی خبر کیا ملی کہ خوشی سے پھولے نہیں سمائی۔ کالج سے واپس آنے پر نعیمہ کو الگ کمرے میں بُلا کر ہدایت دی کہ بناؤ سنگار کے ساتھ ڈھنگ کے کپڑے پہن کر ڈاکٹر کی ماں کے سامنے آنا۔ اس کے بعد عاصفہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''دیکھو منحوس کی بچی آج ڈاکٹر صاحب کی ماں نعیمہ کو
دیکھنے آ رہی ہے۔ تم کسی بھی صورت میں سامنے آنے کی
کوشش نہ کرنا۔ بس رسوئی گھر میں کام کرتی رہنا۔ شربت
اور پھر چائے نعیمہ خود لائے گی''۔

''جی ممانی جان''۔ عاصفہ مری مری آواز میں اتنا کہہ گئی۔

شام کو ڈاکٹر علوی کی ماں آ گئی تو عابدہ نے گرمجوشی کے ساتھ اُس کا استقبال کیا

اور پھر نعیمہ شربت اور پھر چائے لے کر سامنے آ گئی۔

''یہ ہماری بیٹی نعیمہ ہے۔ بی اے کا امتحان دے رہی ہے۔ ڈاکٹر بننے کا شوق رکھتی ہے'' عابدہ نے پہل کی

''لیکن علوی بیٹے نے عاصفہ بیٹی کی بابت کہا تھا۔''

''ارے بہن اُس بد نصیب کو لیکر کیا کرو گی۔ پیدا ہوتے ہی اپنے ماں باپ کو کھا گئی۔'' عابدہ نے لقمہ دیا

''لیکن میرے بیٹے کی پسند عاصفہ ہے۔''

''کہاں ہے وہ''؟

اتنے میں ماموں سجاد اپنی بھانجی عاصفہ کو لیکر سامنے آیا۔ ڈاکٹر علوی کی ماں نے اُسے گلے لگایا اور ماتھا چوما۔ اُس کے بعد ہینڈ بیگ سے سونے کا ہار نکال کے اُس کے گلے میں ڈال دیا۔ ماموں اندر ہی اندر اِتنا خوش کہ جیسے قارون کا خزانہ ہاتھ لگا ہو۔

سادہ تقریب میں نکاح خوانی کی رسم ادا کی گئی۔ اور جب بیٹی عاصفہ کو رخصت کیا تو ماموں سجاد ڈار نے گلوگیر آواز میں ڈاکٹر سے کہا

''علوی بیٹے عاصفہ کو لے جاؤ! اِسی بستی سے کوسُوں دُور جہاں تلخ ماضی کا سایہ تک اُس کا ساتھ نہ دے۔ بارہ برس کی قید با مشقت کے بعد اُسے خلاصی ملی ہے۔ اِس گھر میں ایک باندی کی طرح کام کرتی رہی''

ماموں سجاد ڈار کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا۔ مگر اُس کے چہرے پر ابدی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

اُجاڑ

''کم بخت کہیں کی، ہزار بار کہہ دیا کہ صبح صبح اپنا منحوس چہرہ مجھے نہ دِکھایا کرو۔ تمہیں اِتنا بھی احساس نہیں کہ تم بانجھ ہو اور سویرے بانجھ عورت کا چہرہ دیکھنا بہت بُرا سمجھا جاتا ہے کتنی بار کہوں کہ سویرے میرے سامنے نہ آیا کرو۔''

''ماں جی! اس میں میرا قصور کیا ہے؟''

''بارہ برس ہو گئے شادی کو اور ابھی تک چوہے کا بچہ تک پیدا نہ کر سکی۔ تم تو بنجر زمین ہو۔ یکدم اُجاڑہ۔ اجاڑہ زمین سے کسی قسم کی پیداوار کی اُمید رکھنا عبث ہے۔ آیندہ سویرے میرا راستہ کاٹنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم پر تو خدائے تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا ہے''

نائیلہ کی ساس نے اُسے دیکھتے ہی زہر اُگلنا شروع کر دیا۔ اور نائیلہ بے چاری دم بخود ہو کر ساس کے چلائے ہوئے نشتر حسب سابق اپنے معصوم دل پر سہے جا رہی تھی۔ اُس نے آنسو بھری آنکھوں سے از راہ مُروت اپنے سُسر کی جانب عاجزانہ انداز میں

جھانکا۔ اُس کے وتیرے سے بھی اُسے رحم یا ہمدردی کے بجائے نفرت وحقارت ہی نظر آئی۔

دِل مسوس کر رہ گئی نائیلہ۔ کُرتے کے دامن سے آنسو پونچھتے ہوئے جھاڑو اُٹھائے دالان میں فرش صاف کرنے کی غرض سے گُھس گئی۔ ساس اور سُسر کے بار بار کے طعنے اُس کی دماغی وسعتوں میں ہتھوڑے برسا رہے تھے۔

صحن کی صفائی کرتے نائیلہ سوچنے لگی کہ کیا اولاد پیدا نہ کرنے کے جُرم میں فقط عورت ہی سزا کی حقدار ہے کیا اس میں مرد کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔

ویسے نائیلہ کا شوہر عماد اُسے دل وجان سے چاہتا تھا۔ وہ دونوں شادی کے بعد سے ہی ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہنے لگے تھے۔ ازدواجی زیست سے وابستہ بارہ برس خوش گوار انداز میں بیت گئے۔ کبھی بھی ایک دوسرے کو کسی طرح کی شکایت کا موقع نہ ملا۔ یہی وجہ تھی کہ ساس اور سُسر کی بے مُروتی وکرخت اندازی سے لبریز سلوک اپنانے کے بعد بھی نائیلہ شریک زندگی کی محبت وہمدردی کے باعث اطمینان کی زندگی گذار رہی تھی۔

نائیلہ بارہا عماد کو سمجھاتی رہی۔

"دیکھو جی! میرے ساتھ کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس چلو۔ اپنا چک اپ کرالو۔ میں بھی اپنا چک اَپ کراونگی، ہوسکتا ہے کہ ہمارے سونے آنگن میں ننھا مہکتا پھول کِھل سکے۔ ہماری ویران زندگی میں بھی بہار آئے۔"

"نائیلہ اولاد کا ہونا نہ ہونا کردگار کے ہاتھ میں ہے

میں تو اِتنا جانتا ہوں کہ تم میری شریک حیات ہو، زندگی کا
ساتھی، ہم پلہ۔ میں تمہیں دِل سے چاہتا ہوں۔ تمہاری
شرکت میں ساری زندگی گذارنا چاہتا ہوں۔ بچے نہیں تو
کیا ہوا۔ خدا کی مشیّت کے آگے کسی کا کیا دخل۔ میں تو
خوش قسمت ہوں کہ تم جیسی زیرک اور محبت کرنے والی
بیوی ملی ہے۔ کیا اولاد کے بغیر لوگ زندہ نہیں رہتے۔''

والدین عماد پر زور دیتے رہے کہ دوسری شادی کر لے تا کہ اُن کو پوتا پوتی کا مُنہ دیکھنا نصیب ہو۔ عماد نے اُن کی چاہت کو سختی کے ساتھ ٹھکرا دیا۔

''میں مرنا پسند کروں گا مگر نائیلہ کو موجودگی میں
دوسری شادی کی بابت سوچنا بھی گناہ تصور کرتا ہوں۔''

دن بھر ساس سُسر کی جلی کٹی باتیں سُن کر نائیلہ شام کو عماد کی پیار بھری صحبت میں شب کچھ بُھول جاتی تھی۔ عماد کے علاوہ اُس کی نند عارفہ بھی نائیلہ کو بہت چاہتی تھی۔ والدین کے غیر مساویانہ سلوک کے برعکس عارفہ بھابھی کا دُکھ بانٹنے کی نیت سے دِلاسا دیا کرتی تھی۔

''بھیا! ابا اَمی بے چاری بھابھی کو روز تنگ کرتے
ہیں۔ گالیوں سے نوازتے ہیں وہ تو بس دن بھر خاص کر
آپ کی عدم موجودگی میں رویا کرتی ہے۔ آپ دوسری
شادی کرلو ہوسکتا ہے کہ ابا اَمی کی اولاد سے متعلق خواہش
بھرآئے۔''

ایک روز عارفہ نے صلاح دی

''عارفہ! میں دوسری شادی کی بابت سوچنا بھی گناہ

تصور کرتا ہوں۔ جو پیار میرے دل میں نائیلہ کے لئے

وقف ہے میں اُسے بانٹ نہیں سکتا۔''

وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔ عماد کو دفتری کام سے مہینہ بھر کے لئے لداخ جانا پڑا اس دوران نائیلہ کو ساس سُسر کی جلی کٹی سُننی پڑی۔ وہ اپنی بدنصیبی پر فقط خلوت میں آنسو بہایا کرتی تھی۔ لے دے کے ایک عارفہ ہی اُسے صبر کرنے کی تلقین کیا کرتی تھی۔ عارفہ کے سہارے ہی نائیلہ وقت گزارتی تھی۔ ایک مہینہ گذرنے کے بعد بھی عماد واپس نہیں آیا۔ ہر ایک کو فکر لاحق ہوگئی۔

ایک روز ڈاکیہ رجسٹرڈ لفافہ نائیلہ کے نام لے آیا جسے عارفہ نے وصول کر کے بھابھی کے ہاتھ میں تھمادیا۔

''بھابھی یہ لو بھیا کا خط، اب تو خوش ہو جاؤ، رو رو کے اپنا کیا حال بنا دیا ہے''

اگلے روز نائیلہ حسب معمول سویرے نہیں جاگی۔ اُس کی عادت تھی سویرے اُٹھ کے صحن والے نلکے سے پانی بھرنا، صفائی کرنا اور ناشتہ تیار کرنا۔

عارفہ نے آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

''کیا بات ہے عارفہ، خیر تو ہے''

ماں بھابھی اُٹھی نہیں ہے۔ دروازہ بھی نہیں کھولتی۔''

''آخر بات کیا ہے'' ماں تذبذب میں پڑ گئی۔

''کل بھیا کا خط بھابھی کے نام آیا تھا۔ نہ جانے اُس میں کیا لکھا تھا'' یہ عارفہ تھی۔

دروازہ توڑ دیا گیا۔ سامنے فرش پر نائیلہ اوندھے منہ پڑی تھی۔ اُس کے بائیں ہاتھ میں عماد کا خط تھا۔ عارفہ نے بھابھی کو اُٹھانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ اُن کی رُوح قبض عنصری سے پرواز کرگئی تھی۔

عارفہ پُھوٹ پُھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگی۔ اتنے میں نائیلہ کے سُسر نے عماد کے خط کو ہاتھ میں لیا۔ اور پریشانی کی حالت میں پڑھنے لگا۔

جان سے پیاری نائیلہ

''آج میں تم پر ایک راز کا انکشاف کرنا چاہتا ہوں اِس اُمید کے ساتھ کہ تم مجھے معاف کروگی۔ تم ہمیشہ میرے والدین سے بانجھ ہونے کے طعنے سُنتی رہی۔ میری خاطر تم غم واندوہ کے نشتر جگر پر سہتی رہی۔ ان طعنوں اور نشتروں کا حق دار تو میں ہوں۔ ہاں اصل مجرم میں ہوں! ڈاکٹر نے مجھے صاف صاف بتادیا تھا کہ میں کبھی باپ نہیں بن سکتا۔ مرد تو تھا البتہ بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت مجھ میں عنقا تھی۔ میں خودغرض تمہیں دل وجان سے چاہتا تھا اس لئے اس اہم راز سے تمہیں واقف نہ کیا۔ جو قدم میں آج اُٹھانے جارہا ہوں نہ اُٹھاؤں تو تمہاری زندگی یونہی اجیرن بنی رہے گی۔۔۔ مجھے بہت پہلے یہ قدم اُٹھانا تھا لیکن میں تمہیں اپنے سے جُدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ سراسر میری خودغرضی تھی۔ جس کے لئے

خدائے تعالیٰ بھی معاف نہیں کرے گا۔ میرے والدین
میری دوسری شادی کرنے پر بضد ہے۔ میں نہیں چاہتا
کہ تمہاری طرح میں کسی اور لڑکی کی زندگی بھی برباد کر
دوں۔ اب مجھے احساس ہوا ہے کہ اس دنیا میں میرا جینا
فضول ہے بے کار ہے۔۔۔ جب تک تمہیں یہ خط ملے گا
میں اس بے وفا دنیا کو خیر باد کہہ چکا ہوں گا۔

میری طرف سے نائیلہ آخری التجا ہے کہ تم اپنی پسند
سے دوسری شادی کر لینا۔ تا کہ میرے گھر یعنی قید خانے
سے تمہیں رہائی مل سکے۔ اُمید کہ مجھے اس بابت مایوس
نہیں کرو گی۔"

تمہارا گناہ گار عماد

پورے گھر میں ماتم چھا گیا۔ ساس اور سُسر نائیلہ کو فرش پر سے اُٹھانے لگے جو
بے جان مورتی کی طرح اکڑ گئی تھی۔ عماد کی راہ پر گامزن نائیلہ نے بھی اس عارضی دنیا سے
سدا کے لئے ناطہ توڑنے میں اپنی عافیت جان لی۔



زمانے کے رنگ

کچھ روز سے ایک سیاہ سایہ، تعاقب تو نہیں ساتھ ضرور دے رہا ہے میں جب دفتر جانے کیلئے نمائش سٹینڈ پہنچتا ہوں تو سایہ اکثر اوقات موجود ہوتا ہے۔ چھانہ پورہ گاڑی میں سوار ہوتا ہوں تو وہ سایہ بھی حسن اتفاق سے ساتھ ہو جاتا ہے۔ گو مجھے چھانہ پورہ کے آخری بس اسٹینڈ پر اترنا پڑتا اور سایہ یا برقع والی پہلے ہی مائسمہ کالونی کے پاس اُتر جاتی تھی۔ جتنی دیر نمائش گاہ کے اسٹینڈ پر بس کے انتظار میں کھڑا رہنا پڑتا یا جب وہ شاید بادل نخواستہ جدا ہو جاتا اتنی دیر تک نقاب کی جالیوں کا رُخ (جب بھی نگاہ اس طرف جاتی) اپنی جانب معلوم ہوتا۔

اکثر سوچا کرتا کہ یہ برقع پوش خاتون دوسری گاڑی میں سفر کیوں نہیں کرتی۔ بہت ساری گاڑیاں اور میٹاڈار چھانہ پورہ سے ہو کر جاتی ہیں۔

ایک دن جان بوجھ کر دس پندرہ منٹ دیر سے میں اسٹینڈ پہنچا وہ سایہ برابر موجود تھا۔۔ اگلے روز جان بوجھ کر آدھ گھنٹہ دیر کر دی پھر بھی متذکرہ سایہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا۔۔۔ ایک دن میں نے چھانہ پورہ کی تیار میٹاڈار چھوڑ دی۔ برقع پوش بھی اس میں سوار ہو گئی تھی وہ اُتر پڑی اور میرے ساتھ دوسرے میٹاڈار میں سوار ہو گئی۔

کیا بتاؤں کہ وہ کیسا سایہ تھا۔

بھرا بھرا جسم۔۔ گورے گورے اور چوڑے ہاتھ لمبی لمبی انگلیاں جیسے قلمی مچھلیاں، دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی میں انگوٹھی۔

مندری پر حرف "A" کندہ

پنڈلیوں تک سیاہ ریشمی برقع ۔۔۔ پنڈلیوں سے نیچے گلابی شلوار کیا بتاؤں کہ اس برقع کے تعاقب سے مجھ پر کیا گذری۔ طرح طرح کے خیالات دل و دماغ میں اُبھرنے لگے۔

بیگم سے جان کی امان اور بچوں کی جان کا صدقہ طلب کرتے ہوئے صحیح عرض کرتا ہوں کہ زندگی میں شاید پہلی بار یہ احساس ہوا کہ ہم بھی کچھ ہیں۔ ابھی مجھ میں دم خم ہے۔ کیا ہوا اگر سفید چاندی جیسے بال بکثرت سر کی کھیتی میں اپنا اعلان کرنے لگے ہیں۔

ہو نہ ہو دل میں کچھ کالا نہ سہی گرم مصالحہ ضرور ہے۔

یقین کیجیے جہاں اپنی صورت خدائے برتر نے ایسی نہیں بنائی کہ دیکھ کر راہ چلتوں کو قے آجائے وہاں کبھی یہ خیال بھی نہیں گذرا تھا کہ ہم بھی یوسف کشمیر ہیں جلہاں دیکھ کے سایہ یا برقع اپنی انگلیاں شہید کر دے ۔۔۔ یوسف ہونے کی بات دور کی صاحب ہمیں تو اس قابل بھی صورت نہیں ملی کہ کوئی محترمہ کسی محفل میں اتفاق سے ہی ہمیں منہ لگائے۔ ہمارے دل میں حسرت بھی نہیں اٹھی کہ ہم اس لائق ہین کہ کوئی قبول صورت محترمہ ہماری بابت سوچے۔

ہائے بیگم کی حسرتوں وارمانوں کا خون کیسے ہو! یہ تو بیگم کی نوازش ہے کہ میری صورت سانولی قرار دے کر اپنے دل کو سمجھانے میں کامیاب اتری۔ لیکن پھر بھی میری بے راہ روی سے لبریز طبیعت کے باعث بدگمانیاں جنم لینے لگیں۔ نہ جانے کیوں بیگم کو میرے پیار پر وشواس نہ رہا ۔۔۔ میں اس کا دل رکھنے کیلئے اور اس خیال سے کہ پردیس کی لڑکی ہے کچھ کہتا بھی نہیں۔ سوچتا ہوں کہ اس وادی میں اس کی ڈھارس بندھانے والا کوئی نہیں ہے۔ کیوں نہ میں ہی صبر کی سل دل پر رکھوں۔ ویسے میں زبان کھول دوں تو مخالفین بھی داد

دیئے بغیر نہیں رہتے لیکن نہ جانے کیوں میں غصے میں آئے فقط بیگم سے بات چیت کا سلسلہ کچھ وقت کیلئے منقطع کر دیتا ہوں۔

پہلے پہل اپنا خون پسینہ ایک کر کے تھکا ہارا جب گھر پہنچ جاتا تھا تو از راہ اُلفت بچوں کی امی کی خوشامد کیا کرتا تھا تا کہ اس کی پیشانی کی شکنیں دور ہوں لیکن جب میری خوش اخلاقی کا خاطر خواہ جواب نہ ملا تو میں نے اپنا رویہ بدل دیا اور اب تو صفائی میں کچھ کہنے یا سننے کے بجائے چپ سادھ لینے میں ہی اپنی خوشی جانتا ہوں اور اس بدلتی روش کا پھل لگتا ہے، خدائے برحق نیک ہی دے گا۔

میٹاڈار اکثر لدی بھری ہوتی ہے تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی اور اکثر کھڑے کھڑے سفر کرنا پڑتا ہے۔ اس پُر ہنگم صورتحال میں خوش پوش جیب کُترے خوب مزے میں رہتے ہیں البتہ صنف نازک کیلئے کچھ سیٹیں مخصوص کر دی گئی ہیں کیا مجال کہ کوئی مرد ذات اس مخصوص نشستوں پر قبضہ جمائے۔

ایک دن تنگ آ کر لالچوک میں بس اسٹینڈ میں اترنے پر میں محترمہ سے مخاطب ہوا۔

"کچھ روز سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ میرا تعاقب کرنے لگی ہیں، کیا اس کا سبب جان سکتا ہوں"

"تعاقب میں آپ کا کر رہی ہوں یا آپ میرا کر رہے ہیں"

اُس نے نپی تلی زبان میں جملہ ادا کیا کہ میں اچنبھے میں پڑ گیا۔۔۔۔اس قدر نفیس ملبوسات میں ملبوس دوشیزہ اور آواز اس قدر کرخت، خیر میں نے اُلجھنا نہ چاہتے ہوئے اور محترمہ کے منہ نہ لگنے کی خاطر کہہ دیا۔

''ہوسکتا ہے کہ میرا ہی قصور ہوا چھا معاف کر دیجئے''۔

''لیکن میں اب آپ کو کیسے چھوڑ دوں۔آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا''

''کہاں''میری زبان غیر ارادی طور تذبذب میں کام کرگئی۔

''میرے گھر''۔''کس لئے''

''اپنی عزت کی حفاظت کیلئے آپ نے چلنا ہوگا''۔

''کوئی زبردستی ہے کیا''میری حالت ابتر ہونے لگی۔

''سیدھے سیدھے چلئے ورنہ میں ایک اچھا ہنگامہ کھڑا کر دوں گی۔''

''میں تیار ہوں''۔۔۔۔۔۔میں نے نہیں چاہا کہ بات آگے بڑھ جائے اور سرِراہ میری عزت نیلام ہو جائے مجبوراً بھرے بھرے قدم اُٹھاتا اس کے ساتھ چل دیا۔

مجھے اپنے آپ پر افسوس ہو رہا تھا کہ کہیں یہ سیاہ برقع میری زندگی میں انار کی نہ لائے۔آبی گذر کی بنڈو والی گلی میں گھس کر ایک گھر کا پٹ کھول دیا''آئے! اندر آجائیے''

میں دروازے کے اندر گھس گیا اور کمرے میں ایک محترمہ نے استقبال کیا اور پھر یقین کیجئے میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔معاملہ ہی ایسا تھا!

سیاہ برقع کے اندر سے کوئی حسینہ نہیں بلکہ میرے جانے پہچانے بچپن کے دوست انور احمد نکلے۔۔۔۔میں اُسے دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ یہ سوانگ اُس نے کیوں رچایا۔ہم دونوں گلے ملے اور دور کھڑی اس کی اہلیہ شمی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔میں تذبذب میں کچھ پوچھنے والا تھا کہ انور کی زبان وا ہوئی:

''ارے امجد حال ہی میں جموں سے میرا تبادلہ ہوا ہے سوشل ویلفیئر محکمہ میں ملازم ہوں چھانہ پورہ یونٹ میں پوسٹنگ ہے کیا کروں میٹاڈار میں جگہ مشکل سے ہی ملتی

ہے۔ اس مصیبت سے نجات پانے کی غرض سے میں آپ کی بھابی کا شلوار اور برقع استعمال کرلیا کرتا ہوں ایسا کرنے سے کم از کم گاڑی میں بیٹھنے کو سیٹ آسانی سے مل جاتی ہے۔ کیا کروں یونٹ کا انچارج سخت قسم کا آدمی ہے۔ ذرا سی دیر ہو جانے پر آگ بگولہ ہو جانا اس کا معمول بن گیا ہے۔ نوکری کی سلامتی کیلئے میں نے یہ روپ دھار لیا ہے یونٹ میں گھس کر ڈریس تبدیل کرتا ہوں۔ یونٹ میں زیادہ عورتیں کام کرتی ہیں اس لئے کوئی ایک اصلیت نہیں جانتا ما سوائے چوکیدار کے جو اپنا راز دار ہے۔

جب سے یہ سلسلہ شروع کیا ہے سفر آرام سے کٹ جاتا ہے آپ کو دیکھ کے میں نے تعاقب کرنا شروع کیا تا کہ انداز دِگر میں آپ سے رابطہ قائم کرسکوں۔۔۔ کیوں کیسی رہی یہ آٹھ برسوں کے بعد کی ملاقات۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ بچپن کے ایام اور پھر وہ چند سال نظروں کے سامنے رقص کرنے لگے جو ہم دونوں نے جموں میں ایک ساتھ گذارے تھے۔ ان دنوں بھی مقامی ڈرامہ منڈلی میں انور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ اب بھی بہروپیہ کا سوانگ رچانا اس نے ترک نہیں کیا ہے۔ اتنے میں بھابی شمی نے چائے لائی اور چائے نوش کئے میں رخصت لے کر گھر کی جانب چل پڑا۔

اور سوچتا رہا۔

اس سیاہ سایہ کے بارے میں

اپنے دفتر کی لاوارث وشکستہ عمارت کے بارے میں اور جانوروں کی طرح لدی پھندی میٹاڈوروں کے بارے میں۔ چلو کم از کم سیاہ برقع کے چکر سے نکل کر آرام کا سانس نصیب تو ہوا۔

کھرا اور کھوٹا

عقیل صبح دیر گئے نیند سے بیدار ہوا۔ نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر کمرے میں داخل ہوا تو میمونہ کو اپنا منتظر پایا۔ چائے پینے بیٹھا تو میمونہ نے کہا۔

''رات دیر سے آئے تھے۔ اور پریشان سے ہو۔ مجھے بھی تو بتاؤ کہ آخر معاملہ کیا ہے''

''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے میمونہ''

عقیل نے روکھے پن سے کہا اور باہر دالان میں رکھی کرسی پر بیٹھ کے اخبار کی ورق گردانی کرنے لگا۔۔۔۔ سرسری طور کلیدی سرخیوں کو پڑھ کے اُس کے خیالات کا سلسلہ شروع ہوا۔۔۔۔۔۔

چاندنی کا حسین و دل کش چہرہ اُس کے روبرو منڈلانے لگا۔ اُس کی گفتگو کا انداز۔۔۔ اُس کا خوش اندازی سے گانا۔ اُس کا محبت سے لبریز برتاؤ۔۔۔ اور اُلفت بھری نظروں سے جھانکنا غرض چاندنی کا سراپا ایک کشش کی طرح عقیل کو اپنی طرف کھینچنے لگا۔

دفتر میں عقیل کا دِل کام میں نہین لگا۔ بس یہ فکر تھی کہ کب شام ہو جائے اور یونس کی شرکت میں چاندنی کی صحبت اپنا لے۔۔۔ گویا چاندنی کی دل لبھا دینے والی اداؤں نے عقیل کو دیوانہ بنا ڈالا تھا۔ اُس کے لئے چاندنی کی ہر ادا رنگین اور ہر بات شیرین تھی۔

شام ڈھلے یونس کا انتظار کرنے کے بجائے چاندنی کے کوٹھے کی جانب عقیل کے قدم بڑھنے لگے۔

چاندنی خوشی سے پھولے نہ سماتی تھی کہ ایک اور شکار ہاتھ آ گیا ہے۔ اُس نے عقیل کو اپنے ادھ ننگے سینے سے لپٹا لیا اور کاروباری لہجے میں گویا ہوئی۔

''عقیل نہ جانے تم نے مجھ پر کیا جادُو کیا ہے دیکھو تو سہی اب میں نے کسی دوسرے سے ملنا جُلنا بھی ترک کر دیا ہے۔ میرے دل و دماغ میں تمہارے خیال کے سوا اور کسی شئے کا گذر ہی نہیں۔۔۔۔۔''

چاندنی نے موقع کا فائدہ اُٹھائے رفتہ رفتہ چیزوں کی فرمائش شروع کر دی۔ اِن مختلف چیزوں کی طلب کو جوش و جنون کی حالت میں عقیل نے بلا عُذر قبول کر لیا۔ یہ خیال بھی نہ ہوا کہ اتنی فرمائش پوری کر سکے گا کہ نہیں۔ تنخواہ ملتے ہی عقیل سیدھا بازار گیا اور چاندنی کی طلب کردہ تمام چیزیں خرید لیں۔ تھری ویلر میں چیزیں چاندنی کے ہاں چھوڑ گھر کا رُخ کیا۔

''میمونہ میرے قریبی دوست نے تین ہزار کی رقم اُدھار لی ہے۔ مجبوراً دینے پڑے''

باقی بچی رقم میمونہ کے ہاتھ میں تھمائے عقیل کہہ گیا اور جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے نکلنے لگا۔ میمونہ نے عقیل کا ہاتھ تھام لیا اور تاسف انگیز لہجے میں بولی

''دیکھئے صاف صاف کہئے معاملہ کیا ہے۔ رات کو دیر سے آیا کرتے ہو۔ اور نشہ کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔ میرے ساتھ بولتے بھی نہیں۔ کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے۔ مجھ سے کوئی

قصور سرزد ہوا ہے تو میں نادم ہوں۔ میری کوئی حرکت یا عادت

تمہیں بُری لگی ہو تو بتا دو"

عقیل نے بے رخی کے ساتھ میمونہ کا ہاتھ جھٹک دیا اور خفگی سے بولا۔

"رہنے دو اِن باتوں کو۔ مجھے زیادہ بک بک کرنے کی فرصت نہیں۔"

اس کے ساتھ ہی عقیل باہر چلا گیا۔۔۔۔شام کو حسب معمول کوٹھے کا رُخ کیا۔

۔۔پردہ ہٹا کے چاندنی مخصوص کمرے سے داخل ہوئی۔ بلا کا سنگار تھا۔ ہلکے گلابی رنگ کی ساڑھی میں اُس کا توبہ شکن حُسن اور بھی نِکھر گیا تھا۔

دِن گذرتے گئے۔ اب زیادہ سے زیادہ وقت عقیل کوٹھے پر ہی گذارنے لگا۔ ایک شام چاندنی بناؤ سنگار کے بغیر ہی عقیل کے روبرو نمودار ہوئی۔ بغل گیر ہونے پر عقیل کی زبان وا ہوگئی۔

"تمہاری بے عیب خوبصورتی میں کسی شئے کی کمی رہ گئی ہے۔ زیور کیوں نہیں پہنے ہیں آج"

چاندنی نے قدرے مچلتے ہوئے افسردگی میں ڈوبے ہوئے کہا

"وہ زیور میرے اپنے نہیں تھے۔ وہ اپنی سہیلی کو واپس کر دیئے ہیں"

"اچھا یہ بات ہے چاندنی مجھ سے پہلے کیوں نہیں کہا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں دو چار روز میں زیورات کا بندوبست ہو جائے گا"۔

چاندنی نے عقیل کو بے وقوف بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اُس کی خاطر و تواضع میں بھی آگے آگے رہتی بلکہ ایسا بھی رویہ اپنایا گیا تھا کہ عقیل کو خیال تک بھی نہ گذرے کہ وہ کسی اور سے راہ ورسم رکھتی ہے۔

میمونہ شوہر کو اُداس دیکھ کر فکر و اضطراب سے نڈھال ہوگئی۔ اُسے اندیشہ ہوا کہیں عقیل کسی مصیبت میں گرفتار تو نہیں ہوگیا۔ قریب آ کر اُس نے اپنائیت سے لبریز لہجے میں دریافت کیا۔

''کیوں کیا بات ہے اس قدر پریشان کیوں ہو۔؟''

جواب میں عقیل ایک منجھے ہوئے اداکار کی طرح زار زار رُونے لگے۔۔۔۔ شوہر کی خلاف معمول حرکت سے حیران ہو کر میمونہ نے پے در پے سوال کیے۔ جن کے جواب میں عقیل نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:

''اُس نے نوکری حاصل کرنے کے واسطے ایک نیم سرکاری ادارے سے تیس ہزار کی رقم اُدھار لی تھی۔ جس کی ادائیگی وقت پر نہ ہونے کے باعث ادارہ نے نالش کی دھمکی دی ہے۔ اگر نالش کر دی گئی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ میری عزت بُرباد ہو جائے گی۔ میں کیا کروں۔ اس ذلت سے چھٹکارا کیسے ہو۔''

اتنا کہہ کے عقیل میمونہ کی جانب مایوسانہ انداز میں دیکھنے لگا۔۔۔۔ میمونہ نے گھبراتے ہوئے زبان وا کی۔

''کہو اس بابت میں کیا کر سکتی ہوں۔ میری جان تک تمہارے لئے حاضر ہے۔ ویسے میرے میکے والے بھی اِتنے امیر نہیں کہ یہ رقم ادا کر سکیں''

''میمونہ تمہارا کہنا بجا ہے البتہ ایک صورت ہے کیا کروں کہتے ہوئے بھی جان جاتی ہے۔''

''اچھا کہہ تو دو''۔ یہ میمونہ تھی۔

"میمونہ اگر کچھ مدت کے لئے تم اپنے زیورات دیدو تو یہ

مصیبت ٹل جائے گی۔ زیور کسی کے پاس گروی رکھ کر میں قرض

ادا کر سکوں گا۔ کیا تم یہ قربانی میری بھلائی کی خاطر دے سکو گی"

"کیوں نہیں"

میمونہ کہتے ہوئے اُٹھی لاکر میں سے زیورات کی پوٹلی اُٹھا لائی اور شوہر کے ہاتھوں میں تھما دی۔۔ اُس کے چہرے پر ذرہ بھی افسردگی کی جھلک نہ تھی۔ بلکہ عقیل کی چاہت پوری کرتے اُسے مسرت محسوس ہو رہی تھی۔

عقیل کا چہرہ بشاشت سے لبریز ہو اُٹھا۔ اُس نے میمونہ کی جانب محبت بھرے انداز سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین نہیں پڑتا کہ تم اتنی بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جاؤ گی۔ اپنے سنگار کی چیزیں مجھے اُٹھا کر دو گی"۔

اور پھر مُسکراتے ہوئے زیورات کی پوٹلی بغل میں تھامے باہر کا رُخ کیا۔ زیورات صاف کرا کے عقیل نے عقل کے اندھے کی طرح چاندنی کے ہاتھوں میں تھمائے اور ساتھ ہی بغل گیر ہو گیا۔۔۔ چاندنی بے حد خوش کہ اُس کی مکارانہ روش کام کر گئی۔ اس بار اُس نے عقیل کو خوش کرنے کی ہر ترکیب اپنائی۔۔۔ باتوں باتوں میں پیمانہ و صراحی کے دور چلے۔ جام پر جام لنڈھائے گئے۔۔۔ عقیل معمول سے زیادہ پی گیا۔ پوری طرح نشے میں مدہوش ہوا تھا۔ چاندنی نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اُسے ایک طرف دھکیل دیا اور خود ڈرسنگ ٹیبل کے سامنے بناؤ سنگار میں لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے چاہنے والوں کی محفل حسب دستور گرمانے لگی۔ شراب کے دور چلے اور پھر ناچ وگانا۔

چاندنی مستانہ وار گا رہی تھی۔

اِس دوران عقیل کو ہوش آیا۔ چاندنی کو لوگوں کے سامنے ناچتے گاتے دیکھ کر اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''رکھیل کہیں کی۔ کہتی تھی کہ وہ صرف اُسے چاہتی ہے۔'' یہ سوچتے عقیل آگے بڑھا۔ چاندنی کے بدن پر اپنی بیوی کے کچھ زیورات دیکھ کے اُس کا خون کھول گیا۔

''ذلیل عورت! تم تو بازاری عورت سے بھی بدتر ہو۔ اُتار میرے زیورات ــــ میں تمہیں زندہ ــــــــ''

اتنے میں موجود لوگ مع یونس عقیل پر ٹوٹ پڑے۔ وہ سب نشے میں تھے۔ ہنگامہ بڑھ گیا۔

عقیل کو ہوش آیا تو اپنے آپ کو بڑے چوک کے نکڑ پر پایا ــــ سنسان رات اور آس پاس کوئی نہیں۔ اتنے میں برقع پوش خاتون رکھشے میں سے اُتری اور عقیل کو سہارا دیے کر رکھشا میں بٹھا کے گھر لائی۔

عقیل کا نشہ مکمل طور کافور ہو چکا تھا۔ وہ میمونہ کے قدموں پر گر کے گڑگڑانے لگا۔

''میمونہ مجھ ذلیل کو معاف کردو! میں تمہاری قدر نہ کرسکا۔ کاش میں مرجاتا ــــ

''مریں تمہارے دشمن'' میمونہ بات کاٹے کہہ گئی۔

''خدائے برحق کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تمہیں اپنی نادانی کا احساس ہوا۔ ہمت سے کام لو اور کھرے کھوٹے میں تمیز کرنے کی قوت اپنے میں برقرار رکھو۔''

☆☆☆

پیروی

فیروز محکمہ سوشل ویلفیئر میں بحیثیت انسٹرکٹر اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ آج اُس کی طبیعت صبح سے ہی بھاری لگ رہی تھی۔ دفتر سے جلدی گھر آیا اور نمازِ ظہر ادا کرنے کے بعد بستر پر دراز ہوا۔ شریک زندگی ذاکرہ سر دبانے لگی تا کہ کچھ آرام ہو۔

اتنے میں کسی نے دروازے پر دستک دی۔ فیروز جاگ پڑا۔ ذاکرہ نے دروازہ کھولا۔

اُن کا پڑوسی ریحان تھا جو مقامی ہسپتال میں کمپونڈر کے طور کام کرتا تھا۔ ریحان حسب عادت فیروز کے ساتھ اِدھر اُدھر کی گپیں ہانکنے لگا۔ ذاکرہ چائے لیکر آ گئی۔ باتوں باتوں میں ریحان نے سماج میں سرعت کے ساتھ پھیلی اخلاق شکن سرگرمیوں کا ذکر چھیڑا۔ خاص کر آج کے کچھ کلیدی اخبارات کی سرخیوں کے توسط سے اُن قحباؤں کا ذکر چھیڑا جو گھناونے طریقوں کو اپنائے مفلس و نادار والدین سے دودھ پیتی بچیاں خرید لیتی ہیں اور پھر ایک مخصوص انداز میں پال پوس کر اُن کو قحبہ خانے کی زینت بنا دیتے ہیں۔

اتنے میں ریحان کو آج کا واقعہ یاد آیا اور سُنانے لگا۔

''فیروز میں جس غرض سے یہاں آج آیا تھا وہ بھول ہی گیا تھا۔ ہاں تو رات گئے ایک دیہاتی اپنی بیمار بیوی کو

ہسپتال لایا تھا۔ بیوی وقت سے پہلے ہی ایک بچی کو جنم

دے کر مرگئی۔ اور میں نے اندازہ لگایا کہ دیہاتی نوزائیدہ

بچی سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے۔ تم چاہو تو اِس بچی کو گود لے

سکتے ہو۔ تاکہ اِس سونے گھر میں رونق آجائے۔"

"بچی کو کیا کریں۔ لڑکا ہوتا تو سوچ لیتے"

فیروز کے بجائے رسوئی گھر سے ذاکرہ کی آواز اُبھری۔

"بھابھی! ایک بے کس و مفلس بچی کو اپنا کر خدائے برتر

کی خُوشنودی حاصل کرلو۔"

"ہم نے ٹھیکہ لے رکھا ہے نادار بچوں کا"

ذاکرہ کی بات سُن کر فیروز کی حالت ہی بدل گئی۔ اُس کے چہرے پر افسردگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔۔۔ اُس کے ذہن میں گئے گذرے واقعات ایک ایک کر کے اُبھرنے لگے۔ اُسے اپنی پیدائش کی کہانی یاد آ کے تڑپانے لگی جو اُس نے اپنے منہ بولے والد رمضان جواد کی زبانی سُنی تھی۔

فیروز خود بھی بُرے نصیبوں والا بچہ تھا۔ اُس کے ماں باپ کا کوئی علم نہیں کہ وہ کون تھے۔ نہ جانے کون سی ماں تھی جس نے نو ماہ شکم میں میری پرورش کی اور دنیائے آب وگِل میں آنے کے ساتھ ہی مجھ سے کنارہ کشی اختیار کرنے میں ہی اپنی عافیت جان لی۔ ۔۔ نہ جانے باپ تھا بھی یا ماں کی عیاش فطرتی کی نشانی۔ منہ بولا والد رمضان علی الصبح ٹہلتے ٹہلتے پیر بابا کی درگاہ کی جانب جارہا تھا کہ سامنے سیڑھی پر ایک معصوم بچہ کالی کمبل میں لپٹا روتا ہوا ملا تھا۔ اُس نے ازراہِ انسانیت اُٹھالیا اور ایک بیٹے کی طرح پرورش کی اُس

درسِ عبرت

انور ایک غریب گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔۔۔اُس کے والد محکمہ اوقاف سے صرف تین سو روپے ماہانہ تنخواہ پاتے تھے۔۔ کثیر العیال ہونے کے سبب گھر کا گذارا بہت مشکل سے ہی ہوتا تھا۔۔۔انور کو پڑھنے لکھنے کو بہت شوق تھا۔ کچھ والد کی کمائی۔۔۔ کچھ ٹیوشن اور کچھ وظایفی انجمنوں سے تعاون حاصل کر کے بی اے کی ڈگری حاصل کر ہی لی۔۔۔

یہ انور کی بہت بڑی خوش قسمتی تھی کہ اُسے والد کی کوششوں سے ایک نیم سرکاری ادارے میں ملازمت بھی مل گئی۔۔۔۔انور کو ملازمت کرتے ابھی پورا ایک سال بھی نہیں گذرا تھا کہ اس کے والدین نے اُس کی شادی رچادی۔۔۔۔اور اپنی حیثیت کے مطابق خاصی دھوم دھام سے انور کی دُلہن کو بیاہ کر اپنے گھر لے آئے۔

انور کی شادی کو تقریباً چار ماہ ہو گئے تھے۔غریبی کے باوجود بھی دونوں کا وقت بہت عمدگی سے گذر رہا تھا کہ انور کو مجبوراً ملازمت کے سلسلہ میں ہندوستان سے باہر جانا پڑا۔چنانچہ تین سال کے لئے ایگریمنٹ کر کے انور کویت چلا گیا۔۔۔

انور شریف النفس تھا اپنے والدین کا تابعدار اور اپنی رفیقہ حیات پر بہت مہربان تو تھا ہی۔۔۔۔مگر ساتھ ہی اپنے کام میں بہت ہوشیار۔۔۔محنتی اور کفایت شعار بھی تھا۔۔۔۔

کویت پہنچ کر اُس نے ہر مہینے بڑی پابندی کے ساتھ خاصی رقم بنک ڈرافٹ کے ذریعہ اپنے والدین کو بھیجنی شروع کر دی۔۔۔اور کچھ رقم وہ بنک میں بھی جمع کرتا رہا۔۔۔

تین سال کا طویل عرصہ انور نے اپنوں سے الگ رہ کر۔۔۔۔اور خاص کر

شریکِ حیات سے جُدا رہ کر بڑی ہمت اور صبر سے گذارا۔ کبھی کبھی تو وہ ان سب لوگوں کی یاد میں پوری پوری رات جاگ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں گذار دیتا۔

خدا خدا کر کے تین سال پورے ہوگئے۔۔۔ افسران نے انور کی محنت اور ایمانداری سے خوش ہوکر از حد زور لگایا کہ انور مزید تین سال کیلئے ایگریمنٹ کر کے کویت میں رُک جائے۔ متعلقہ افسران نے اُس کی تنخواہ میں بھی اضافہ کر دیا۔۔۔۔۔ لیکن انور اپنے والدین کی زیارت۔۔۔ رفیقہء حیات سے ملاقات۔۔۔ بہن بھائیوں کی دیکھ بھال اور یار دوستوں سے ملنے کے لئے بے قرار تھا۔۔۔۔ اس لئے اس نے کمپنی کی پیشکش کو قبول نہیں کیا۔ اور گھر کے لئے روانہ ہوگیا۔

ساحلِ ہند پر قدم رکھتے ہی انسانی فطرت کا تقاضہ ہوا کہ اتنی مدّت کے بعد اپنے گھر واپس جا رہا ہوں۔۔۔ اس طرح خالی ہاتھ جانا بالکل بھی اچھا نہیں رہے گا۔ یہ سوچ کر وہ اپنا سامان مسافر خانے میں رکھ کر ایک دوست کے ساتھ بمبئے کے پُر رونق بازاروں کے چکر کاٹنے لگا۔۔ بیوی کے لئے سونے کے ٹاپس، کانچ کی چوڑیاں اور کچھ کپڑا وغیرہ خریدا۔ ماں کے لئے مناسب زیور اور دوپٹہ خریدا، بہن بھائیوں کے لئے کُرتے پاجامے اور والد کے لئے ٹوپی اور شیروانی کا کپڑا۔

گھر پہنچتے ہی سب سے مل ملا کر ہر ایک لئے جو کچھ ہدیہ لایا تھا وہ اُن کو دے دیا۔ گھر بھر میں خوشی کا ماحول چھا گیا اور ہر سُو مسرت کی لہر دوڑنے لگی۔ انور کے والدین، بیوی اور بہن بھائی سب ہی خوش تھے۔

رات ایسی ہی خوشی میں گذر گئی صبح کو ناشتہ سے فارغ ہوکر دوستوں رشتہ داروں سے ملنے کی غرض سے چلا گیا۔ دوپہر کو یار دوستوں اور رشتہ داروں سے مل کر انور گھر واپس

کے منہ بولے والد نے اُسے پالنے میں لاکھ مصائب سہے تھے۔ اُس کی بیوی مر چکی تھی۔ اور اکیلے ہی فیروز کا ہر طرح سے خیال رکھا۔ ماں کے پیار سے بھی نوازا۔ آٹھ برس کا تھا کہ بستی میں ہیضہ پھیل گیا۔ فیروز بھی اُس کی زد میں آ گیا اور رمضان جواد نے اُس کی تیمارداری میں دن رات ایک کردئے تھے۔

اس کے ساتھ ہی فیروز کے کانوں میں اُس کے مرتے ہوئے منہ بولے والد رمضان کے الفاظ گونجنے لگے۔

''فیروز بیٹے جس طرح میں نے تمہاری پرورش کی ہے۔
اِسی طرح غریب اور لاچار کی اعانت کرنا اپنا شعار
بنالینا۔''

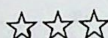
والد کی اِس آخری وصیت کا لحاظ رکھتے ہوئے فیروز نے یتیم خانہ جاکے ایک بے آسرا لڑکی ذاکرہ کو شریک حیات کا درجہ بخشا۔ چھ برس ہوگئے شادی کو لیکن اولاد کی نعمت سے محروم۔ ریحان کی تجویز سُن کر فیروز کو لگا کہ منہ بولے والد کی آخری خواہش کے تحت قرض چکانے کا وقت آیا ہے۔ فیروز ریحان کی شرکت میں ہسپتال کے سپرانڈنٹ کے پاس گیا۔ وہاں پہلے ہی ایک عمر رسیدہ عورت بیٹھی تھی۔ جو نوزائیدہ بچی کو حاصل کرنا چاہتی تھی۔۔۔ نزدیک جاکے ریحان نے بوڑھی عورت کو پہچان لیا۔ وہ اپنے آپ کو بیوہ جتا کے بچی کو گود لینا چاہتی تھی۔ البتہ حقیقت میں وہ قحبہ شبراتن تھی۔ ایک بدنام اڈے سے وابستہ تھی۔ جہاں منشیات کا استعمال بے دریغ کیا جارہا ہے۔ اور لاچار و مُفلس عورتوں کو قحبہ گری کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

الغرض نوزائیدہ بچی کو فیروز نے حاصل کرلیا اور ذاکرہ کی گود میں ڈالے فخریہ

انداز میں بولے۔

''ذاکرہ بچہ بچہ ہے۔لڑکا ہو یا لڑکی اس لاچار کو پال کے
ہم اُس کردگار کے ہاں سرخرو ہوں گے۔''

ذاکرہ نے بچی کو کلیجے سے لگالیا۔ اُسے لگا اُس کی سونی گود بھر گئی اور منہ بولے والد کی آخری خواہش کی پیروی کرتے ہوئے فیروز کو ایسا لگا کہ جہاں بھر کی خوشیاں اُس کے دامن میں آگئی ہوں



آ گیا، گھر کے دروازے پر اُس نے قدم رکھا ہی تھا کہ اُس کی ناک نے تیز قسم کی بد بو محسوس

کی، جیسے لاکھ اور کپڑا جلتا ہو۔۔انور ناک بند کیئے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہہ اُٹھا۔۔۔

''امی جان۔۔۔ !چولہے میں کیا جل رہا ہے

۔۔۔۔؟ کپڑ گندھ جیسی بد بو آ رہی ہے''۔۔۔۔۔

یہ کہہ کر وہ کمرے میں داخل ہوا تو نقشہ ہی بدلا ہوا پایا۔۔۔مسرت اور خوشی کی

بجائے ہر جانب اُداسی و مایوسی دیکھنے کو ملی، ماں تو غصہ میں لت پت۔۔۔بیوی کے چہرے

پر یاسیت۔۔۔اور بہن رضیہ پر افسردگی طاری تھی۔۔۔۔

انور حیران کھڑا تھا کہ اُس کی ماں نے چلا کر کہا۔۔۔۔۔۔

''جلتا کیا۔۔۔۔؟ تیری بیوی نے تیری لائی ہوئی

کانچ کی چوڑیاں چولہے میں ڈال دی تھیں۔۔۔اُن کی

راکھ جل رہی ہے۔۔۔''

یہ سب تماشہ دیکھ کر اُس کے دل پر چوٹ لگی۔وہ غم اور غصہ کی شدت سے کانپنے لگا۔

رضیہ بہن سے دریافت کرنے پر اصلیت سامنے آ گئی۔۔۔دراصل پرسوں

ساس بہو کی آپس میں لڑائی ہوئی تھی اور وہ ایک دوسرے سے بولتی نہیں تھیں۔۔۔

انور جب پردیس سے واپس آیا تو اُس نے سب کو تحفے دیئے۔۔صبح دوستوں

سے ملنے کے لئے چلا گیا بیٹھے بیٹھائے ماں نے بہو سے طنزیہ انداز میں کہا۔۔۔

''مجھ سے لڑتی رہتی ہے اور میرے بیٹے کی لائی ہوئی

چوڑیاں پہنے خوب مٹکتی پھرتی ہے''

تند مزاج بہو بھلا ساس کی بات کیوں برداشت کرتی۔۔جھٹ اُس کی زبان

چلنے لگی۔۔۔''تیرے بیٹے کی ہیں تو ڈال چولہے میں۔۔۔میں پہنوں گی تو اپنے خصم کی پہنوں گی۔۔۔''

اس کے ساتھ ہی چوڑیاں چولہے میں ڈال دیں۔۔۔اس پر ہی بس نہیں کیا بلکہ ایک اور تیر اپنے ترکش سے نکال کر گویا ہوئی۔۔۔

''یہ تم ہی بے شرم ہو کہ میرے خصم کا لایا ہوا ڈوپٹہ
اوڑھے کھڑی ہو۔۔''

بہو کا یہ زہر میں بُجھا فقرہ سنکر ساس بھی تلملا اُٹھی۔اور اُس نے بھی ڈوپٹہ سر سے اُتار کر چولہے میں جھونک دیا۔۔۔اور کہا۔۔۔

''لے۔۔۔تیرے خصم کا ہے تو ڈال اِسے بھی
چولہے میں میں اُوڑھوں گی تو اپنے پُوت کا لایا ہوا ہی
اوڑھوں گی۔۔۔''

یہ ساری دُکھ بھری داستان سُن کر انور کا تو چین و آرام ہی لُٹ گیا۔۔اور اُس کی رگ رگ میں درد و بے قراری سرایت کر گئی۔

مسلسل تین سال پردیس میں گذارنے کے بعد وطن واپس آکر۔۔۔والدین اور بیوی سے مل کر اُسے جو ایک روحانی خوشی میسر آنی تھی۔۔۔اُس پر یکسر پانی پھیر گیا۔ انور کا دمکتا چہرہ ایک دم اُداس پڑ گیا۔اُس کے دِل میں مچلتی اُمنگیں یکدم ساکت پڑ گئیں۔حسرتیں گوشۂ تنہائی میں ماتم کرنے لگیں۔اُس نے عہد کر لیا کہ ایسے ناقدروں اور ناشکر گزاروں کو کسی طرح کا ہدیہ یا تحفہ دینا قطعی فضول ہے۔اور پھر وہ پہلی فرصت میں نہ چاہنے کے باوجود مزید تین برسوں کے لئے کویت واپس چلا گیا۔

گردشِ دوراں

چودھری سمیع اللہ کا کافی لمبا چوڑا خاندان تھا۔ دُور دُور تک اِس آباد اور خوشحال گھرانے کا نام روشن تھا۔ لیکن نہ جانے کس بدخواہ کی نظر لگ گئی کہ کچھ برسوں میں سرعت کے ساتھ حالات اِس قدر بدل گئے کہ اکثر عزیز و اقارب نے ہجرت کی راہ اپنائے پاکستان جانے میں ہی اپنی عافیت جان لی۔ کچھ تو داعی اجل کو لبیک کہہ گئے اور سمیع اللہ کے بڑے بھائی چودھری وسیم اللہ کاروبار کے سلسلے میں سمندر پار مسقط میں فروکش ہو گئے۔ شادی وہاں ہی کی دوشیزہ سے رچا کر اپنوں سے ناطہ توڑ دیا۔۔۔اب تو وسیع و عریض سہ منزلہ حویلی میں چودھری سمیع اللہ اپنی اکلوتی بیٹی حمیدہ اور بیوہ بہن کلثوم کے ہمراہ قیام پذیر ہیں۔ دو کنال بھرا احاطے میں حویلی کے بازو و عقب میں دو منزلہ کوارٹر تعمیر شدہ ہیں۔ ان کوارٹروں کے علاوہ حویلی کی پہلی و دوسری منزل میں دستیاب کمروں میں کرایہ دار ٹھہرائے گئے ہیں۔ البتہ پہلی اور دوسری منزل میں ٹھہرائے گئے کرایہ داروں کو احاطے کی باہری دیوار کے پاس لکڑی کی سیڑھی اُترنے چڑھنے کے لئے استعمال کرنی پڑتی تھی۔

ساجد بھی اپنی بیوہ ماں کے ساتھ حویلی کی پہلی منزل کے وسطی دو کمروں و رسوئی پر مشتمل فلیٹ میں ٹھہرے ہیں۔ حویلی کے احاطے میں دن اور رات دیر گئے تک ایک ہنگامہ و رونق کا سماں لگا رہتا۔ چودھری سمیع اللہ پیشہ سے ٹھیکہ دار ہیں اور بستی بھر میں وہ

چودھری کاکا کے نام سے مشہور ہیں۔ لیکن اپنوں کی صحبت حاصل نہ ہونے پر اُن کے مزاج میں چڑ چڑا پن حد سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ معمولی سی بات پر غصے میں آکر اول فول بکنے لگتے ہیں۔ ویسے جان پہچان والوں کا کہنا ہے کہ رفیق حیات کی بے وقت موت کے باعث چودھری صاحب کے مزاج میں تلخی و ترشی سما گئی ہے۔ اُس نے غم غلط کرنے کی نیت سے شراب کا سہارا لیا جس کے باعث تلون مزاجی میں بلا کی شدت آنے لگی۔

ساجد محکمہ برقیات کے ضلع دفتر مین کلرک کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ دفتر میں کام کی زیادتی کی وجہ سے اُسے ہفتہ میں کچھ دن دفتری اوقات کے بعد بھی کام کرنا پڑتا تھا۔ آج بھی ہیڈ کلرک چمن لعل کی شرکت میں پاور کنال کی مرمت کرنے کے سلسلے میں ٹینڈر نوٹس مرتب دینی تھی۔ اس لئے دیر سے فراغت پائی۔ سائیکل احاطے کی مشرقی دیوار سے ٹِکا کے بالا خانہ کی سیڑھی سنبھل سنبھل کر چڑھنے لگا کیونکہ سیڑھی کے کچھ پائے شکستہ حالت میں تھے۔ ماں رسوئی کے باہر لکڑی کے تختے پر بیٹھی تھی۔ ساجد کو دیکھے اُس کے پژمردہ چہرے پر اطمینان کے نقوش نمودار ہو گئے۔

''ساجد بیٹا اِتنی دیر''

''کیا کروں ماں کام زیادہ تھا''

یہ کہتے ہوئے ساجد کمرے میں گُھس گیا۔ فائیلوں کا پلندہ گوشۂ راست میں پڑی تپائی پر رکھا۔ عینک اور گھڑی سامنے الماری کے اوپر جمادی اور خود تولیہ ہاتھ میں لئے غسل خانے کا رُخ کیا۔ اُس کے نہا کے نکلتے وقت تک ماں نے حسبِ دستور لیموں کی شربت کا گلاس تیار کر کے تپائی پر رکھا۔ کپڑے بدل کے ساجد نے انگلیوں سے بال سنوارے کمرے کے عقب والی کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ پہلے اِدھر اُدھر جھانکا۔

اطمینان کرنے پر سامنے حویلی کی گیلری والی چق ایک طرف ہٹ گئی اور اندر سجے سجائے کمرے میں چودھری صاحب کی لڑکی حمیدہ بجلی کی دودھیا روشنی میں کھڑی خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ حمیدہ سے نظریں کیا ٹکرائیں ساجد کے چہرے پر اَن جانی رونق چھانے لگی۔

جاندار حُسن کی تاب نہ لا کر وہ لجاجت کے مارے پیچھے ہٹ گیا۔

تپائی پر سے گلاس اُٹھا کے کرسی پر بیٹھا اور شربت پینے لگا۔ حمیدہ اور ساجد کی تانک جھانک پچھلے کئی ہفتوں سے جاری ہے۔ وہ بس ایک دوسرے کو دز دیدہ نگاہوں سے دیکھ لیتے اور کچھ کہہ نہیں پاتے۔ اِس تانک جھانک کی اِبتداء اُس روز ہوئی تھی جب کچھ کرایہ داروں نے چودھری صاحب سے التجا کی تھی کہ ''لکڑی کی سیڑھی کے کچھ شکستہ زینے دُرست کرا دے''

''سنبھل سنبھل کے زینے چڑھا کرو'' یہ چودھری صاحب کا جواب تھا۔

کسی ایک نے چھت کی مرمت کی بات چھیڑ دی۔

اور دیکھتے ہی دیکھتے توں توں میں میں کی نوبت آ گئی

اِس دوران حمیدہ اپنی تمام جلوہ نمائیوں کے ساتھ نمودار ہو گئی

''ابا جان اندر چلئے، چھوٹے لوگوں کے منہ نہیں لگتے''

یہ کہہ کر حمیدہ چودھری صاحب کو حویلی کے اندر لے گئی۔ اور ساجد اوپر گیلری سے سارا ماجرہ دیکھ سُن رہا تھا۔ حمیدہ کی چال ڈھال اور خدوخال کا جایزہ لئے ساجد دم بخود پڑ گیا۔

کرایہ داروں میں ایک ارشد میاں بھی تھے۔ اُس کی بابت مشہور ہے کہ کسی نیم سرکاری اِدارہ میں ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ مقامی اخبار ''روئیداد'' کا نامہ نگار بھی ہے۔

چودھری صاحب کو سُناتے ہوئے اونچی آواز میں چلایا۔

''کمال ہے صاحب! کرایہ ماہ بہ ماہ ادا کرنے کے بعد بھی چھت یا سیڑھی کی مرمت کرنے میں لیت ولعل سے کام لیا جارہا ہے۔ آخر کتنا برداشت کریں۔ اب تو یہ سب کچھ اخبار میں چھاپنا پڑے گا۔ خود ہی ہوش ٹھکانے آجائینگے۔''

ارشد چلتا پرزہ تھا۔ اُس کا یہ تیر خالی نہیں گیا۔ اگلے روز خلافِ توقع چودھری صاحب ارشد کے کمرے میں آگئے۔ ساتھ میں مستری رام دین تھا۔ اور نہایت حلیمی سے ارشد سے مرمت طلب اُمور کی بابت تفاصیل دریافت کرنے لگے۔

ارشد کیا بلکہ آس پاس کے کرایہ دار چودھری صاحب کے اِس مُروت بھرے لہجہ پر حیران تھے۔ رام دین کو سارا کام سمجھانے کے بعد چودھری حویلی کے صدر دروازہ کی جانب بڑھنے لگے تو ارشد کی زبان کام کرگئی

''بہت مہربانی چودھری صاحب! کوئی حکم ہو تو حاضر ہوں''

''ارے بیٹے ہم ایک دوسرے کے کام نہ آجائیں تو کون آئے گا۔ اخبار میں کام کرتے ہو، دھیان رکھنا۔ اِدھر اُدھر کا کچھ چھپنے نہ پائے۔ فضول میں نام پر بٹہ لگ جائے گا۔''

پھر کیا تھا۔ چھت، سیڑھی اور غسل خانوں کی مرمت کے ساتھ ساتھ ارشد کے دونوں کمروں کو رنگ وروغن سے نوازا گیا۔

اب تو معمول سا بن گیا تھا کہ دفتر سے آ کے ساجد کمرے کے عقب میں چھجے پر نمودار ہوتے تو حمیدہ کی زیارت نصیب ہوتی۔ دراصل حمیدہ کے شب باشی کے کمرے کی جنوب والی کھڑکی ساجد کی گیلری سے وابستہ تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو اُلفت بھری نظروں سے دیکھا کرتے۔

ارشد نے ایک روز اِن دونوں کی تانک جھانک کو بھانپا اور پھر ساجد سے اِس بابت تذکرہ چھیڑا۔ لیکن ساجد حد درجہ شریف تھا۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کی وجہ سے حمیدہ کی بدنامی ہو۔ اُس نے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ صاف صاف جِتا دیا کہ حمیدہ کے ساتھ اُس کا کسی طرح کا تعلق نہیں ہے۔

چھت پر نصب شدہ پانی کی مرکزی ٹینکی کی صفائی کرنی مقصود تھی۔ باتھ روم میں پانی آنا بند ہوا۔ مجبوراً دفتر سے واپسی پر ساجد کو احاطے والے نلکے کے پانی سے کُھلی جگہ نہانا پڑا۔ اگرچہ شام کا خفیف اندھیرا اچھل چکا تھا پھر بھی اُسے شرم محسوس ہو رہی تھی۔ نہا کے بنیان اور کچھا نچوڑ رہا تھا کہ حوض کے قریب ہی ساجد کے سامنے کسی چیز میں لپٹا کاغذ کا ٹکڑا گرا۔ اُس نے اوپر گیلری کی جانب دیکھا تو حمیدہ کو چق کی اوٹ میں کھڑا پایا۔ دالان کی جانب دیکھا کہ کہیں ماں نہیں دیکھ رہی ہے۔ پھر ساجد جُھکا اور صابن دانی کے ساتھ ساتھ کاغذ کے گولے کو اُٹھایا۔

جلدی جلدی سیڑھی کے زینے طے کرنے لگا۔

''ماں نہانے میں مزہ آیا۔ موٹی دھار تھی پانی کی''

ساجد گیلا تولیہ سکھانے کی خاطر رسی پر پھیلاتے ہوئے کہہ گیا۔

''کل سے تم صحن کے نل پر نہیں نہاؤ گے'' اُس کی ماں نے کہا

''کیوں ماں! کیابات ہوئی'' ساجد نے حیران ہو کے پوچھا۔

''تم نہار ہے تھے اور چودھری کی بیٹی دیدے پھاڑ پھاڑ کے تمہیں دیکھ رہی تھی''

''تو اُس سے کیا ہوتا ہے ماں'' ساجد نے جھینپتے ہوئے کہہ دیا۔

''بیٹا نظر بد سے خدا بچائے، کھا جاتی ہے یہ اِنسان کو''

''نہیں ماں یہ سب کہنے کی باتیں ہیں'' یہ کہہ کے ساجد کمرے میں گھسا۔ کچھ دیر اخبار پڑھنے میں گذرا اور پھر ماں کو باورچی خانے میں مصروف دیکھ کر ساجد نے گھبراہٹ میں کاغذ کی گرہیں کھول دیں اور ٹیبل لیمپ کی روشنی میں پڑھنے لگا۔

''گیلری میں لگی کھڑکی کا پٹ کُھلا رکھنا۔ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں''

ساجد پسینہ پسینہ ہوا۔ گھبراہٹ میں اُس کا دِل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سونے سے قبل ساجد نے اطمینان کرلیا کہ گیلری والی کھڑکی بند کردی گئی ہے۔ کمرے کی بتی بُجھا کر وہ بستر ے میں لیٹے سوچنے لگا۔

''اگر کسی ایک نے حمیدہ کو دیکھا تو ساری عزت خاک میں مِل جائے گی۔ ماں بے چاری تو جیتے جی ہی مرجائے گی۔ اور پھر چودھری صاحب جیسے نامی گرامی شخص سے کسی طرح کا بیر لینا میری زیست کو ملیا میٹ کرسکتا ہے۔''

ساجد نے بھانپ لیا کہ حمیدہ کا سایہ کھڑکی کے پاس چھجے پر سرک رہا تھا۔ اُس نے دل پر پتھر رکھ کے لیٹنے کی کوشش کی۔۔۔۔

اگلے روز دفتر سے واپس آئے تو ساجد نے ماں کو ڈھنگ کے کپڑے پہنے

اپنا منتظر پایا۔

"ساجد بیٹا تمہاری خالہ زیادہ بیمار ہے۔ میں اُس
کے ہاں جا رہی ہوں۔ شاید رات وہاں ہی ٹھہرنا پڑے۔
تمہاری چائے اور کھانا تیار کر کے رکھا ہے۔"

نہا کے اور کپڑے بدل کر ساجد نے چائے پی لی۔ اور غیر ارادی طور گیلری میں کھڑا خلاؤں میں گھورنے لگا کہ ڈلا میں لپٹا کاغذ سامنے گرا۔ دالان کی کھڑکی کے پاس حمیدہ انداز دگر میں جھانک رہی تھی کمرے میں آ کے ساجد نے کاغذ کھولا۔

"رات کو دس گیارہ کے درمیان میرا انتظار کرنا۔ پیچھے
والا پٹ کُھلا رکھنا۔ ضروری بات کرنی ہے۔ خدا را
میرے بھروسہ کا خون نہ کرو۔"

ساجد کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ماں گھر پر نہیں ہے۔ ورنہ کیا ہوتا۔ گھبراہٹ کے مارے ساجد کا بُرا حال تھا۔ دراصل شرافت اُس کی رگ رگ میں رس بس گئی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ حمیدہ آئے گی اگر کسی نے اُسے آتے دیکھا تو غضب ہوگا۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔۔۔۔ کھانا کھا کے وہ جلدی بتی گُل کئے بستر پر دراز ہوا۔ کچھ دیر بعد باہر گیلری میں آہٹ محسوس ہوئی۔ ساجد نے بھاری دل کے ساتھ افراتفری کے عالم میں کھڑکی کا پٹ کھول دیا۔ حمیدہ جھٹ سے کمرے میں گُھس آئی۔ ساجد اُسے واپس جانے کے لئے کہنا چاہتا تھا لیکن الفاظ حلق سے باہر نہ آئے۔

"نائٹ لیمپ جلا دو"

حمیدہ نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور لمبا سانس لیا۔

ساجد کی حالت برابر سراسیمگی سے لبریز۔۔۔۔وہ پسینے سے شرابُور تھا۔

''باہر سے میں آئی اور کپکپا تم رہے ہو''

حمیدہ نے پلنگ کے سرہانے بیٹھ کے لحاف کا کونہ سرکاتے ہوئے کہا۔

بدلے میں ساجد دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے تھر تھر کانپنے لگا۔حمیدہ نے اُسے گھورتے ہوئے سرگوشیوں میں کہا۔

''ساجد اس حالت میں تمہاری ماں آجائے تو۔۔۔''

''ارے غضب ہوگا۔تم تو بڑے باپ کی بیٹی ہو۔ میں
ایک قلاش اور بیوہ ماں کا اِکلوتا سہارا۔ ہمارے مابین
زمین آسمان کا فرق ہے۔۔۔ کہاں آسمان کی وسعتوں
میں دمکتا چاند اور کہاں اِس لق ودق صحرا کا ایک ادنیٰ ذرہ''

بدلے میں شرارت آمیز تبسم حمیدہ کے چوڑے وسرخ ہونٹوں پر تھرکنے لگا۔اُس نے بے تکلفی میں ساجد کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر زبان وا کی۔

''ارے تم تو تھر تھر کانپ رہے ہو۔ پہلے کسی لڑکی سے تنہائی میں نہیں ملے ہو۔۔۔تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔میرے ابا آجائیں یا تمہاری ماں۔تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔کیونکہ میں اپنی مرضی سے از خود تمہارے کمرے میں آئی ہوں۔یقین کرلو میں تمہیں دل سے چاہتی ہوں۔بے تحاشا پیار کرتی ہوں۔۔۔'

''نہیں حمیدہ جی ''ساجد بات کاٹتے بول اُٹھا

''کہاں تم ایک درخشندہ ستارا اور میری حیثیت موری
کے کیڑے سے کسی طور زیادہ نہیں۔۔۔تمہارے پتا جی

کا نام ہے۔ مجھ سے پیار جتانے سے تمہیں کچھ بھی حاصل

نہ ہوگا۔ ماسوائے پریشانی و کرب کے۔۔۔۔۔ چودھری

صاحب تو زمین و آسمان ایک کردینگے۔ ۔۔۔اور

خدانخواستہ اگر چودھری صاحب یا اور کسی کا ہاتھ میرے

گریباں کی طرف بڑھنے لگا تو میری ماں جیتے جی

مرجائے گی۔ اُس کا اِس بڑی دنیا میں میرے سوا اور کوئی

نہیں۔''

اِتنا کہہ کے ساجد حمیدہ کی جانب عاجزانہ نگاہوں سے گھورنے لگا۔

''ساجد! مجھے مایوس نہ کرو۔ ایک تم ہو کہ خاندان اور

ماں کی خاطر میرے پیار کو ٹھکرانا چاہتے ہو اور ایک میں

ہوں کہ تمہاری پناہ میں آنے کے لئے بڑی سے بڑی

قربانی دینے کو تیار بیٹھی ہوں۔ مجھے اس طرح سے نہ

ٹھکراؤ کہ کہیں کی نہ رہ جاؤں۔۔ ارشد تو اُبو کے بڑے

چہیتے بنے پھرتے ہیں۔ وہ اُس کے ساتھ شطرنج کھیلا

کرتے ہیں اور رات دیر گئے تک اِکٹھے شراب پیا کرتے

ہیں۔ اُس بد معاش نے بسا اوقات مجھے شیشے میں

اُتارنے کی کوشش کی لیکن میں اُس کی غرض بھری چاہت

کو پائے حقارت سے ٹھکراتی آئی ہوں۔۔۔۔اُس شرابی

کے ساتھ زندگی نہیں گذار سکتی۔ تمہارے ساتھ گھر سے

بھاگنے کو بھی تیار ہوں۔"

اتنا سُننے کے بعد بھی شرافت کا پُتلا ساجد ٹس سے مس نہ ہوا۔ گو وہ حمیدہ کو دِل سے چاہتا تھا لیکن لوک لاج کا زیادہ خیال تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی معمولی سے لغزش کے باعث اُس کی ماں کا سر نیچا ہو۔ یا اُسے کسی طرح کے طعنے سُننے پڑیں۔۔۔۔ عاجزانہ انداز اپناتے ہوئے گویا ہوئے۔

"مجھے معاف کر دو حمیدہ! گو میں تمہیں دِل سے چاہتا ہوں لیکن ایسی کسی حرکت کا مُرتکب نہیں ہونا چاہتا جس کے باعث میری ماں کو تکلیف یا پریشانی سے دوچار ہونا پڑے۔ میں تو ماں کی خوشی کی خاطر مر مٹنے کو تیار ہوں۔۔۔ تمہیں گھر سے بھگا کر لے جانے کی بابت میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ محبت ایک پاک جذبے کا نام ہے ہوس پرستی یا جذبات کی رو میں بہنے کا نام محبت نہیں۔"

اتنا کچھ سُننے کے بعد حمیدہ کی حالت غیر ہوگئی۔ اُس کے بشاش چہرے پر مایوسی و اُداسی کے نقوش واضح طور اُبھرنے لگے۔ کچھ کہے بغیر وہ گیلری کی جانب بڑھنے لگی اور کھڑکی پھلانگ شب باشی کے کمرے میں گھس گئی۔ ساجد کھڑکی بند کرنے اُٹھے تو اُس کی نظر احاطے کے بائین جانب لکڑی کے ٹال کے مالک آفاق خان کے بیٹے نعیم خان پر پڑی جو مدھم آواز میں رباب بجا رہا تھا اُسے لگا کہ نعیم خان نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔

ساجد کی نیند غائب! کبھی حمیدہ کی بابت سوچنا اور کبھی اس خیال سے کہ پٹھان

کے بچے نعیم نے اُسے حمیدہ کے ساتھ دیکھ لیا ہے۔ کہیں وہ چودھری صاحب یا اُس کی ماں کو نہ بتائے۔ طرح طرح کے خیالات اُس کے ذہن میں اُبھرنے لگے اور سراسیمگی کی حالت میں یہ بلا کی رات اُس نے آنکھوں آنکھوں میں کاٹ لی۔

اگلے روز دفتر سے واپس آنے پر ساجد نے ماں کے رویئے میں کسی طرح کی تبدیلی نہ پا کے اطمینان کا سانس لیا۔ اُس کے بعد کمرے کی کھڑکی کا پٹ کھولے جھانکنا شروع کیا۔ مخصوص جگہ پر دبیز پردہ پڑا تھا۔ اور دالان والی کھڑکی بھی خلاف معمول بند پڑی تھی۔

دِن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں گذر گئے۔ ساجد اندر ہی اندا اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ اب نہ ہی سامنے والی چق ہٹی اور نہ ہی حمیدہ نے اُسے نظر بھر دیکھنے کی سعی کی۔ ساجد پہروں دالان پر گذارتا لیکن حمیدہ کی جھلک دکھائی نہ دی۔ جیسے حمیدہ کہیں چلی گئی ہو۔ اب ساجد کو اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ کاش میں نے حمیدہ کے بے لوث پیار کا جواب پیار سے دیا ہوتا۔ تو یہ افسردہ ایام نہ دیکھنے ملتے۔

اگلی صبح احاطے میں کہرام مچا ہوا تھا۔ ساجد نے گھبرا کے لحاف ایک طرف پھینکے ماں کو جگایا۔۔۔ پانی کے حوض کے پاس چودھری صاحب منہ کے بل گر پڑے تھے۔ لوگ اُسے اُٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ حمیدہ کی پھوپھی کا بُرا حال تھا۔ بھائی کی پگڑی کی گرد جاڑے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ساجد اور اُس کی ماں حقیقت حال سے باخبر ہو جانے کی خاطر نیچے آ گئے۔ ارشد بڑی شان سے کہہ رہے تھے۔

"آخری زمانہ ہے۔ صاحب۔ یہ حوازادیاں تو اپنے
عیش کی خاطر خاندان کی عزت کا نیلام کرنے سے بھی

گریز نہیں کرتیں۔ حمیدہ زیورات و نقدی گھر سے لئے

بھاگ گئی ہے۔ اور وہ بھی پٹھان بچہ نعیم خان کے ساتھ۔"

ساجد کے پاؤں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ اُسے لگا کہ اُس کے وجود کو کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دیا گیا ہو۔

اِتنے میں چودھری صاحب ہوش میں آ گئے اور لوگ اُسے حویلی کے اندر لینے لگے۔ اُس کی حالت بہت ہی ابتر تھی۔ ساجد کی ماں نے حمیدہ کی پھوپھی کو سہارا دیا۔ وہ اُسے دِلاسہ دینے لگی۔

"بہن خدا پر بھروسہ رکھ، ویسے جوان ہوتے ہی لڑکی

کی شادی کرنی چاہیے۔۔۔"

اس پر حمیدہ کی پھوپھی نے رُو رُو کر کہا

"بہن! بھائی صاحب کے کہنے پر میں حمیدہ اور ساجد

کا رشتہ طے کرنے آپ سے ملنے ہی والی تھی کہ یہ حادثہ

ہوا"

ساجد نے سب کچھ سُن لیا۔ اُس کی حالت قابل رحم تھی۔ وہ اپنی تیرہ بختی پر ماتم کرنے لگا۔ کاش میں اتنا ڈرپوک نہ ہوتا۔ کاش میں نے حمیدہ کی محبت کا جواب محبت سے دیا ہوتا۔ کمرے میں گھس کر وہ بچوں کی طرح ٹھاٹھا کر رونے لگا۔

اگلے روز غیر ارادی طور ساجد نے گیلری والی کھڑکی کے پٹ کھول دئے۔ سامنے کاغذ میں لپٹا مٹی کا ڈلا پڑا تھا۔ سُرعت کیساتھ کھڑکی پھلانگ کے ڈھیلا اُٹھا لیا۔۔۔۔ اور کمرے میں گھس حمیدہ کے خط کی گدازیوں میں جھانکنے لگا۔

''ساجد صاحب۔خوش رہو۔آباد رہو۔

اب میں تمہیں تنگ نہیں کروں گی۔ بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہاری اس بے وفا نگری سے جا رہی ہوں۔ سوچتی ہوں کہ میں کتنی بدنصیب ہوں۔ تمہیں دل و جان سے چاہا اور خوش تھی کہ من پسند ساتھی کے ساتھ میری زندگی سکون سے گذرے گی۔ لیکن خدائے برحق کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کاش تم اِتنے وفاشناس، فرمانبردار اور ڈرپوک نہ ہوتے۔۔۔۔۔ارشد کمینے نے موقع کا فائدہ اُٹھائے اُبو کے ساتھ رابطہ بڑھا دیا۔ دونوں ایک ساتھ شراب پیتے۔۔۔ایک رات جبکہ میری پھوپھی کی طبیعت ناساز تھی۔ اُبو کو ارشد نے زیادہ مقدار میں شراب پلا دی۔۔۔۔ اُبو وہی پلنگ پر ڈھیر ہوگئے اور ارشد نے مکارانہ انداز اپنائے میرے کمرے کا رُخ کیا۔ گو میں نے مزاحمت سے کام لیا۔لیکن حالات اس قدر ناموافق تھے کہ لاکھ کوششوں کے بعد بھی میں اپنے وجود کو بدنامی کے دلدل بھرے کھڈ میں جا گرنے سے نہ بچا سکی۔ بربادی کی چادر اُوڑھے میں نے چاہا کہ اب ارشد کو ہی رفیق زندگی کے طور چُن لوں۔لیکن یہ اصلیت جان کے کہ وہ نہ صرف شادی شدہ ہیں بلکہ دو بچوں کے باپ بھی ہیں میرے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ ڈور کٹی پتنگ کی صورت میں خلاؤں میں ہچکولے کھانے لگی۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔

اپنے آپ کو میں اِس دھرتی کا بوجھ سمجھنے لگی۔۔۔ عین اُس وقت جبکہ میں اپنے وجود کو مٹانے کی نیت سے احاطہ والے کنویں میں کودنا چاہتی تھی نعیم خان نے آگے بڑھ کر مجھے سنبھالا۔ حالانکہ میں اُسے ایک موالی غنڈہ جان کے نفرت کرتی تھی۔ لیکن بخدا وہ پٹھان بچہ ہمت والا نکلا۔ اُس کا بروقت دست تعاون دراز کرنے سے کم از کم میرے پیٹ میں پلنے والے بچے کو باپ کا نام تو مِل جائے گا۔ میں نے نعیم خان کے ساتھ بھاگ جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ کاش تم اِس قدر شریف و ڈرپوک نہ ہوتے آپ شاید مجھے اس سب کے لئے قصوروار ٹھہراتے ہوں لیکن میں کسی کو قصوروار نہیں ٹھہراتی۔ شاید یہی ہمارا مقدر تھا۔۔۔ اِنسان بے بس ہے۔ کیا چاہتا ہے اور کیا ہوتا ہے دراصل ہم سب گردش دوراں کے آگے بے بس ولاچار ہے۔۔۔

خدا حافظ

فقط غم زدہ حمیدہ''

☆☆☆☆☆

☆☆☆

☆

افسانچے

انتظار

برسوں سے مفلسی وتنگ دستی کی مار سہتے سہتے اب ہم تھک چکے ہیں۔ گومیرے ساتھ ساتھ میرے ابواور امی نے بھی ہاتھ پاؤں مارے۔ لیکن جی توڑ محنت کے بدلے میں حاصل کردہ رقم کا بڑا حصہ دادا جی کے علاج و معالجہ پر ہی صرف ہوتا اور ہمیں دووقت کی دال روٹی بھی بہ مشکل میسر ہوتی تھی۔

چھوٹے بہن بھائی کو اچھی تعلیم دینا تو درکنار ڈھنگ کا لباس بھی پہننے کو نہیں ملتا۔

داناؤں کا کہنا ہے کہ انسان کا مقدر اس کے اپنے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور ہم نے بھی تک ہار کر اپنی قسمت بدلنے کا مصمم اِرادہ کرلیا ہے۔

کچھ مدت چارپائی پر براجمان ایڑیاں رگڑنے اور ملک الموت کو سدایاد کرتے چوراسی (۸۴) سالہ دادا جی بھی بہ خوشی راضی ہوگئے۔ اس منصوبے کو روبہ عمل لانے سے جہاں دادا جی کو برسوں کی اذیت سے سدا کے لئے چھٹکارا مل جائے گا ہمیں سرکار سے دو لاکھ روپے نقد حاصل ہونگے۔

بس اب اگلے دنگے کا شدت کے ساتھ انتظار ہے۔

بیدار مغز

پُر آشوب حالات کے زیر اثر ایک مذہبی رہنما کو کسی غنڈے نے علی الصباح گھر کے باہر موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ ردعمل کے طور اگلے روز کچھ نا معلوم نقاب پوش بندوق برداروں نے مقامی مسجد میں نماز مغربین ادا کرنے والوں پر اندھا دھند گولیاں برسا کر درجن بھرافراد کو دائمی نیند سلا دیا۔

ان دو جانکاہ واقعات کے بعد کشیدگی اور آپسی کدورت میں نہایت اضافہ ہوا۔ خوف وہراس بستی کی ہر گلی میں راج کرنے لگا اور بے اعتمادی کی فضا ہر گھرانے میں ہاتھ پاؤں پھیلانے میں کامیاب نظر آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اب تک ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والوں نے نفرت و دشمنی کی راہ پر گامزن ہونے میں ہی اپنی عافیت جان لی۔ الغرض ایک خدا، ایک رسول ﷺ، ایک مذہب ایک قرآن اور ایک قبلہ کو ماننے والے ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے۔

اسی دوران سلامت گلی کے نکڑ پر ہاتھ میں چھری لئے ایک نوجوان نے آنکھیں پیلی کر کے ایک لاغر شخص کو روک کر غصے سے پوچھا

"ارے بوڑھے سچ بتاؤ، سُنی ہو یا شیعہ؟"

معمر شخص نے قدرے توقف کے بعد اطمینان کے ساتھ خنجر بردار کا جائزہ لیا اور

تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا:

''بیٹے میں سنی ہوں نہ شیعہ بلکہ خدائے برحق و برتر کے فضل وکرم سے ایک مسلمان ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ دین اسلام کا پیروکار اور آخری پیغمبر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمتی ہونے کا شرف حاصل ہے۔اس کے بعد بھی اگر میرا خون بہانے سے تمہیں کسی طرح کی راحت مل سکتی ہے تو لو، میرا سینہ حاضر ہے''۔

نوجوان گہری سوچ میں پڑ گیا۔اس کا جوش ٹھنڈا پڑنے لگا۔ماتھے پر اُبھری غصے کی سلوٹیں ایک ایک کر کے غائب ہو گئیں اور آنکھوں میں ندامت کے نقوش واضح انداز میں اُبھرنے لگے۔پھر نہ جانے کس جذبے کے تحت اس نے دائیں ہاتھ کو حرکت دی اور خنجر اپنے ہی سینے میں پیوست کر دیا۔



مین ہول

رات سرد اور تاریک تھی

کہرے کی وجہ سے اندھیرا چھایا تھا

اکرم نے اِدھر اُدھر جھانک کر اطمینان کیا اور ''مین ہول'' پر رکھے وزنی ڈھکن کو جدو جہد کے بعد اُٹھانے میں کامیاب ہوا۔ ڈھکن کو احتیاط کے ساتھ سائیکل کے کیریر کے ساتھ باندھا اور چل پڑا۔ سیٹھ رزاق کے کارخانے کے قریب رُک گیا۔ کارخانے میں کام چل رہا تھا۔ اکرم کو رقم ملی اور ڈھکن کو دھکتی ہوئی بھٹی میں ڈالا گیا۔

دو پگ حلق پر انڈیلے اکرم گھر لوٹا

دیر تک سوتا رہا

لوگوں کی چیخ پکار نے اُسے جگا دیا۔

لوگ بدحواس ہوکر بڑی سڑک کی طرف دوڑ رہے تھے

''ارے کیا ہوا؟'' اکرم نے بھاگتے ہوئے جوان کا ہاتھ پکڑ کے پوچھا۔

''تم ---- تمہیں ---- تمہیں نہیں معلوم چاچا''۔ نوجوان نے حیرانی کے عالم میں کہا۔

''اکرم چاچا رات کو کسی کمینے نے بڑی سڑک کے مین ہول کا ڈھکن چُرایا ہے۔ تمہارا بیٹا وسیم اسکول جاتے ہوئے اُس میں گر گیا۔''

وفا پرستی

شام کے گہرے، تاریک اور ملگجے سائے پھیلنے لگے، گاؤں سے دور پہاڑی کے دامن میں واقع کھلیان کی کچی اینٹوں کی شکستہ دیوار کی آڑ میں گھنی جھاڑیوں کے پاس دو انسانی پیکر نمودار ہوئے اور دم سکت فضا میں سرگوشیاں گونجنے لگیں۔

''اونہہ''

''ہاں''

''سن رہے ہو انور۔۔۔۔۔''

نہیں! اس وقت میں مدہوش ہوں''

''آخر ہم کب تک اس طرح ملتے رہیں گے۔''

''جب تک قسمت ساتھ دے''

''انور! خدارا کبھی تو سنجیدگی کا مظاہرہ کیا کرو۔''

''کون احمق سنجیدہ نہیں۔ البتہ چاہتا ہوں کہ ان خوشگوار گھڑیوں میں فقط پیار و محبت کی باتیں کریں۔''

''دیکھو نا بستی سے دور اور گھر والوں سے چوری چھپے اس طرح کا ارتباط بڑھانا اچھا نہیں۔ آخر تم اپنے والدین

کے ساتھ بات کیوں نہیں کرتے ہو"۔

"ناہیدہ وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔ بارہا اس اصلیت کا اقرار کر چکا ہوں کہ تم میری زیست کی رعنائی ہو، یقین کرو شریک حیات کا درجہ تمہیں ہی دوں گا"۔

اتنا کہہ کر انور نے آگے بڑھ کر ناہیدہ کا سیدھا ہاتھ تھام لیا۔

"انور کتنے خود غرض ہو تم"

"نہیں ناہیدہ یہ میری خود غرضی نہیں بلکہ وفا پرستی ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ شادی کے مقدس رشتہ میں جکڑنے سے پہلے ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سے جان اور سمجھ لیں"۔

"لیکن تمہیں اس بات کا احساس نہیں کہ۔۔۔۔۔۔"

دفعتاً انور نے ناہیدہ کے منہ پر دایاں ہاتھ چسپاں کر کے باتوں کا سلسلہ منقطع کرا دیا۔۔۔ ساتھ ہی ناہیدہ کے نرم و نازک جسم کو اپنے قوی بازوؤں کے حلقے میں مقید کرنے کی تگ و دو کی۔

شرم سے ناہیدہ پہلے کسمسائی لیکن کچھ دیر بعد نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے وجود کو انور کے رحم و کرم پر چھوڑنے میں اپنی عافیت جانی۔

وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔ کچھ ماہ گذرنے پر ایک روز علی الصباح ناہیدہ کی لاش پن بجلی گھر سے ملحق بڑے تالاب میں تیرتی پائی گئی۔ پوسٹ مارٹم سے یہ معلوم ہوا کہ وہ ماں بننے والی تھی۔

ناہیدہ کے گھر والوں پر غم و بدنامی کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ایک جانب والدین واقرباء بدنامی وشرمساری کا ہدف بنے ناہیدہ کے بے جان جسم کی تجہیز و تکفین کا اہتمام کرنے لگے اور دوسری طرف آس پڑوس کے لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے میں مگن تھے۔

جتنے منہ اتنی باتیں۔ غرض ناہیدہ کے والدین کو ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس غم زدہ اور طعنہ زنی سے لبریز ماحول میں انور کی بھاری بھرکم آواز نمایاں طور پر گونج رہی تھی۔

''حد ہوگئی! ازدواجی رشتے سے دامن بچائے اس صدی کی خاتون نے عیاشی کی زندگی گزارنا اپنا ایمان جان لیا ہے۔ شرم وحیا کے پیراہن تار تار کیے حالیہ زمانہ کی حوازادی بازارِ حسن کی رونق بننے میں فخر محسوس کرنے لگی ہے''۔

اس کے ساتھ ہی کدورت و بے اعتمادی کے کالے بادل آسمان کی وسعتوں میں اِدھر اُدھر غیر ارادی طور پر پھیلنے لگے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وفا پرستی اور وشواس جیسے الفاظ بے وفائی کے لمبے چوڑے صحرا میں اپنی وقعت کھونے لگے۔



وقت وقت کی بات

ہماری رہائش گاہ کے بغل میں شہر کے مشہور وکیل ریاض راٹھور قیام پذیر ہیں۔ دونوں گھرانوں کے مراسم بہت ہی خوشگوار چل رہے ہیں۔ جب بھی ان کو یا مجھے ذاتی یا دیگر مصروفیات سے فراغت ملتی ہے تو ایک دوسرے کی صحبت اپنائے سیاسی سماجی مذہبی یا ادبی مسائل پر تبصرہ آرائی کر کے دل کا غبار ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اتوار کو ناشتہ کرنے کے بعد میرے قدم ریاض منزل کی جانب چل پڑے۔ راٹھور صاحب برآمدے میں ہی آرام کرسی پر براجمان تھے اور ان کے روبرو ایک لحیم شحیم خاتون اپنی روئداد سنا رہی تھی۔ علیک سلیک کے بعد مجھے بازو والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور ساتھ ہی خاتون سے مخاطب ہوئے۔

"دو سال سے معاملہ عدالت کے زیر غور ہے۔ تم چاہو تو طلاق حاصل کرنے کے لئے اب کاروائی کی جاسکتی ہے"

یہ سننا تھا کہ خاتون کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور زبان وا کر دی۔

"نہیں راٹھور صاحب میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں میں طلاق نہیں چاہتی بلکہ میری خواہش ہے کہ میں جب تک زندہ رہوں وہ میری زیست سے وابستہ رہے۔ میں ان کو یہ احساس دلانا چاہتی ہوں کہ عورت مرد کی لونڈی نہیں بلکہ شریک حیات ہوا

کرتی ہے۔عورت کو مرد کی جوتی سمجھنے والے ایسے گمراہ افراد کو سزا ملنی ہی چاہئے۔میری خواہش ہے کہ انور صاحب مقدمہ بازی میں اُلجھا رہے تاکہ دوسری شادی نہ کرسکے۔بس میں یہی چاہتی ہوں۔"

غرضیکہ نپی تلی باتیں کر کے خاتون شان بے نیازی کے ساتھ اپنی جگہ سے اُٹھی اور چلنے سے قبل اپنی بند مٹھی ریاض کے ہاتھ میں خالی کردی۔غالباً وہ اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن میری موجودگی کے احساس نے اُسے چلنے پر مجبور کیا تھا۔

ریاض سے پوچھنے پر اس معاملہ میں مزید جانکاری اس طرح کی ملی کہ رفیقہ بیگم مقامی گرلز کالج میں لیکچرار کے فرائض ادا کر رہی ہے۔اور اسکے خاوند منصور احمد محکمہ تعمیرات کے اے کلاس ٹھیکیدار ہیں۔برسوں سے بدگمانی کا ہدف بنے الگ الگ زندگی گزار رہے ہیں۔اور ان کے موجودہ تعلقات نہایت ہی کشیدہ چل رہے ہیں۔تھوڑی دیر کے لئے میں سوچنے لگا کہ ایک متمول اور پڑھے لکھے گھرانوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی ازدواجی زندگی میں بھی اُنار کی سما سکتی ہے۔کہانی کار ہوں اس لئے رفیقہ و منصور کے باہمی معاملے میں دلچسپی لینے لگا۔جُدا ہوتے ہوئے میں نے ریاض سے تاکید کی کہ اس بابت آئندہ رونما ہونے والے واقعات سے مجھے آگاہ کریں۔

وقت گزرتا گیا اور میرے ذہن سے رفیقہ کے معاملے کے نقوش مدھم ہونے لگے تھے کہ ایک شام جبکہ میں قرۃ العین حیدر کے "کارِ جہاں دراز ہے" کی ورق گردانی کرنے میں محو تھا ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔آواز ریاض کی تھی۔

"ارے احمد کیا بات ہے تین روز سے ملے نہیں"۔

اس وقت یاد کیسے کیا۔ خیریت تو ہے" میں نے بات کاٹتے ہوئے پوچھ لیا۔

"گھبرانے کی بات نہیں۔ دراصل رفیقہ والے معاملے نے عجیب کروٹ لے لی۔ اس کے خاوند نے عدالت کے حکم کو ٹھکراتے ہوئے دوسری شادی کر لی ہے۔

"پھر تو اِسے ضرور سزا ہوگی۔ اور رفیقہ کو بھی انتقام لینے کا اچھا موقعہ مل گیا ہے"

میرے دل میں رفیقہ بیگم کے لئے ہمدردی کے سوتے اُبلنے لگے کہ ریاض کی آواز گونجی۔

"لیکن احمد وہ تو اب کیس لڑنا نہیں چاہتی"

"آخر کیوں؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"منصور صاحب نے دوسری شادی رفیقہ کی چھوٹی بہن قدیسہ سے رچائی ہے۔



بازوبند

ہر طرف اندھیرے کا خوفناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چھوٹی لائین کی مسافر ٹرین جالندھر اسٹیشن سے جموں اسٹیشن کے لئے تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔

بیشتر مسافر نیند کی آغوش میں خراٹے بھر رہے تھے پٹھان کوٹ اور کھٹوعہ کے درمیان غیر آباد علاقے سے گذرتے وقت اچانک ایک جنگلی سانڈ مسافر ٹرین کے سامنے نمودار ہوا۔ سانڈ کے ٹکڑے ہو گئے البتہ ریل گاڑی کے زیادہ تر ڈبے اُلٹ گئے اور گہری کھائی میں گر گئے۔

دِلخراش حادثہ کے ساتھ دل ہلا دینے والی چیخ و پکار خاموش فضا میں گونجنے لگی۔ زخمی لوگوں کی آہ و بکا نے قیامت کا سماں پیدا کیا۔ زیادہ تر مسافر ڈبے خندق میں گرنے کے ساتھ ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

پاس والی پہاڑی بستی سانجوان کے کچھ لوگ جائے حادثہ پر پہونچ گئے۔ کچھ لوگ زخمی سواریوں کو سہارا دینے لگے۔ البتہ کچھ افراد انسانیت و مُروت کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے مردہ عورتوں کے جسم سے زیورات اُتارنے لگے۔ اُن میں گُرچرن سنگھ بھی تھا۔ گلاس فیکٹری میں ادنیٰ ملازم اور نہایت ہی پریشان حال، اکلوتا بیٹا کلونت کچھ دنوں سے بیمار پڑا ہے۔ افاقہ نہیں ہو رہا ہے۔ درکار رقم دستیاب نہ ہونے کے باعث کسی اچھے ڈاکٹر کو نہیں دِکھا سکتا۔

گُورچرن بھی کچھ زیورات اُتارنے میں کامیاب ہوا۔ گھر واپسی کی سوچ رہا تھا کہ اُس کی نظر خفیف روشنی میں اُوندھے منہ گری خاتون کی لاش کے بازوبند پر پڑی۔ اُس

نے تذبذب کی حالت میں بازو بند کھولنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔۔۔۔اتنے میں پاس ہی لوگوں کی آوازیں سُنائی دیں۔ گورچرن نے کمر سے لٹکی کٹاری نکال کے خاتون کا بازو کندھے سے الگ کر دیا اور کرُتہ میں چھپا گھر کی جانب دوڑ پڑا۔

گھر کے پچھواڑے میں بازو بند کھول کے بازو سامنے بہتی ندی میں پھینک دیا۔ زیورات کی پوٹلی اپنی پتنی جانکی کور کے ہاتھوں میں تھما دی۔

''یہ کیا ہے کلونت کے باپو؟''

''ارے گورونانک کو دراصل ہماری حالت پر رحم آیا۔

یہ سونے کے زیورات ہیں۔ اندر چھُپا کے رکھو''

''پر یہ آئے کہاں سے۔ سچ بتاؤ۔ معاملہ کیا ہے کہیں چوری۔۔۔۔۔''

''زبان کو لگام دو جانکی۔ ارے چوری نہیں کی بلکہ

جگ کے داتا ہم پر مہربان ہوئے ہیں۔ میں تو تمہیں آج

تک سونے کی مُندری نہ دے سکا۔ اب ارمان نکال دو۔

اور پھر کلونت کا علاج بھی ڈھنگ سے کرائینگے''

گورچرن بات کاٹتے کہہ گیا۔

پانی کا گلاس حلق پر انڈیلے گورچرن بستر پر دراز ہوا اِس اُس طرح کے خیالات اُس کے ذہنی وسعتوں میں اُبھرنے اور ستانے لگے۔

اگلے روز سویرے ہی دروازہ پر دستک ہوئی جانکی نے دروازہ کھولا۔ پولیس والے کو دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔

''گورچرن سنگھ کہاں ہے؟''

''آواز سُنتے ہی گور چرن ایک مجرم کی طرح پولیس والے کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی حالت نہایت ابتر ہونے لگی۔

''کرپال کور تمہاری کیا لگتی ہے''؟

''صاحب وہ میری بڑی بہن ہے جالندھر میں رہتی ہے خیر تو ہے؟'' گور چرن نے پریشانی کی حالت میں دریافت کیا۔

''اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ کل رات ریل حادثے کا شکار بن گئی۔''

پولیس والے نے گور چرن سنگھ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ہمدردی جتائی۔

''اُس کی جیب سے تمہارا تحریر کردہ خط ملا ہے کچھ دن قبل ہی تم نے پوسٹ کیا تھا۔''

گور چرن رنج و غم کا مجسمہ بن گیا۔ وہ بھیگی پلکیں رومال سے صاف کرنے لگا۔ اتنے میں پولیس والے نے نہایت ہی عاجزانہ لہجہ اپناتے ہوئے کہا

''حوصلہ رکھو گور چرن بھائی۔ سانجوان پولیس چوکی میں تمہاری بہن کی لاش پڑی ہے۔ لے جانا۔ البتہ دُکھ کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ کسی وحشی درندے نے بڑی بے رحمی کے ساتھ اُس کا بایاں بازو کاٹ لیا ہے''

یہ سُننا تھا کہ گور چرن بچوں کی طرح ڈاڑھیں مار کر رُونے لگا اور بے تحاشہ ندی کی جانب دوڑ پڑا۔ جانکی کور بے حس و حرکت زیورات کی پوٹلی کو اندازِ دگر میں گھورنے لگی۔



خواب وخیال

اپنی تو عادت ٹھہری کہ جب تک کہانی یا واردات کے کردار سامنے منڈلانے نہ لگے قلم وقرطاس کا سہارا لے ہی نہیں سکتا۔ ویسے عادتاً زیادہ تر رات کو بستر میں لیٹتے وقت دن بھر کے واقعات ذہن میں رینگنے لگتے ہیں۔

سنیچر کی رات اِس خیال سے کہ کل ایت وار کو چھُٹی ہے

دیر تک کاغذ داغدار کرتا رہا

رات جوان ہونے لگی اور مجھے نیند نے آگھیرا۔ کاغذ قلم سامنے ٹی پائے پر رکھ کر میں نے بیڈ سوئچ آف کر دیا۔

۔۔۔۔۔۔۔۔ بے خودی کے عالم میں بیوی کے گلے کا بگل گھر کی وسعتوں میں گونجنے لگا۔

"سُنتے ہو! میری طبیعت ٹھیک نہیں کم از کم آج بازار سے

سبزی روٹی خرید کے لاؤ"

چارو ناچار بستر سے اُٹھا، غسل خانے سے فارغ ہوئے پرانا تھیلا کاندھے پر لٹکائے گھر سے چل پڑا۔

بڑے چوک میں مندر کے پاس لوگوں کی بھیڑ تھی۔ قریب پہنچا تو دیکھا کہ لوگ آپس میں کُھسر پُھسر کر رہے ہیں۔ میں نے آگے جا کے ایک شخص سے پوچھا۔

"کیوں بیٹے کیا بات ہے"

"چاچا مندر کا پُجاری کل رات اپنے دو ساتھیوں

سمیت مندر کے احاطے میں شراب پیتے پکڑا گیا۔اب
یہ لوگ تھانے سے پجاری کو چھڑانے کی بابت تبادلہ خیال
کرر ہے ہیں۔''

آگے بڑھتا گیا۔عید گاہ کے نکڑ پر کچھ لوگ جمع ہو گئے تھے۔ میں بھی نزدیک گیا۔
پتہ چلا کہ مولوی صاحب مسجد میں نماز پڑھانے کے ساتھ ساتھ مکتب میں بچوں اور بچیوں کو
قرآن شریف کا درس بھی دیتے ہیں اُسے مکتب میں زیر تعلیم نابالغ لڑکی سے دست درازی
کرتے پکڑا گیا۔

ذہنی تناؤ کا ہدف بنے میں سبزی منڈی کی جانب چل پڑا۔ابھی کچھ قدم ہی چلا
تھا کہ کانوں میں ایک سریلی آواز پڑی۔

''وہ حسینہ وہ نیلم پری۔کرگئی کیسی جادوگری''

سامنے گیا تو ایک لڑکا شان کے ساتھ فلمی گانے سنا رہا تھا اور لوگ محظوظ ہو رہے تھے۔

''کیوں برخوردار کتنی جماعت میں پڑھتے ہو؟''میں نے پہل کی

''پانچویں کلاس میں پڑھتا ہوں''لڑکے نے جواب دیا۔

''ہاں تو یہ بتاؤ ہمارے ملک کے صدر کا کیا نام ہے''

''من موہن سنگھ''لڑکا بے تامل کہہ گیا۔

''اچھا ہمارا قومی ترانہ کون سا ہے؟''

''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا''

لوگ قہقہے لگانے لگے

''ہمارا قومی پرندہ کون سا ہے''

''ارے بابو جی مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ فلمی دنیا کی بابت
سوال کرو، فلمی ناموں کے ساتھ ساتھ ہیرو ہیروین کے
نام ازبر ہیں''

میں آگے بڑھا اور سوچتا رہا جس دیش کے بچے اِتنے ذہین ہوں اُس دیش کا مستقبل کتنا شاندار ہوگا۔

سبزی منڈی میں ایک ہنگامہ مچا تھا

''کرپا کرکے دروازہ کھولئے''۔۔۔۔ کرپا کرکے دروازہ کھولئے''

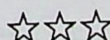
صدر دروازہ پر نصب کال بیل کی آواز نے مجھے نیند سے بیدار کیا۔ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا کہ شریک حیات کی آواز گونجی

''خدارا دودھ میں پانی نہ ملایا کرو۔ دیکھو کتنا پتلا دودھ ہے۔''

''بہن جی میں دودھ میں پانی نہیں بلکہ پانی میں دودھ
مِلا لیتا ہوں، مجبور ہوں، بیس روپے کلو میں خالص دودھ
ملے گا۔ سولہ روپے میں ایسا ہی ملے گا''۔

میں تولیہ، صابون دانی اور دانتوں کا برش لئے غسل خانہ میں گھس ہی رہا تھا کہ بیوی کی آواز نے چونکا دیا۔

''سُنتے ہو جی! آج میری طبیعت ناساز چل رہی ہے
کم از کم بازار سے سبزی و روٹی لے آؤ''۔



نیا سویرا

پرویز ایک خوش خال گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ والد عطااللہ خان محکمہ مال میں ایک ممتاز عہدے پر فائز تھے۔ ماں فریدہ جی مقامی گرلز کالج میں لیکچرار تھی۔ والدین اور چھوٹے بھائی عقیل کی صحبت میں پرویز کا بچپن ولڑکپن خوشیوں اور راحتوں سے لبریز رہا۔ اُس کی ہر چھوٹی بڑی فرمائش پوری کی جاتی۔ لیکن نہ جانے کس بدخواہ کی نظر لگ گئی کہ اچانک مایوسی و تیرہ بختی کے سیاہ بادل پرویز کی بسی بسائی اور آبادنگری کی وُسعتوں میں پھیلنے لگے۔ عین اُس وقت جبکہ پرویز نے گریجویشن اور عقیل نے میٹرک کے اہم امتحانات امتیازی نمبرات کے ساتھ پاس کردیئے اور وہ دونوں آیندہ کے تعلیمی منصوبوں پر والدین و احباب کے ساتھ صلاح مشورہ کررہے تھے ایک دلخراش حادثہ وقوع پذیر ہوا۔

عطااللہ خان نوکری سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ بینک کی مقامی شاخ سے پنشن کی رقم وصول کر کے گھر کی جانب اپنی گاڑی میں آرہے تھے کہ نیلم چوک کے نکڑ پر گرینڈ زور دار دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا۔ گرینڈ کے آہنی ریزوں سے آس پاس کے درجن بھر افراد شدید طور زخمی ہوئے جن میں سے تین افراد زخموں کی تاب نہ لا کر ہسپتال میں دم توڑ بیٹھے اُن میں عطااللہ خان بھی شامل تھا۔ رفیقِ حیات کی بے وقت دائمی جُدائی کے بعد فریدہ کی طبیعت بھی ناساز رہنے لگی۔ جیسے جینے کی خواہش اُسے چھین لی گئی ہو۔ فیملی ڈاکٹر تنویر ارشد نے بغور جائزہ لیا اور اس اصلیت کا انکشاف ہوا کہ دل کے عارضہ نے فریدہ جی کو اپنے چنگل میں لے رکھا ہے۔ نامی گرامی ڈاکٹروں سے علاج کرانے کی غرض سے پرویز نے ماں کو دہلی و بمبئی لے لیا۔ البتہ افاقہ نہ ہوا۔ اور خلافِ توقع جبکہ مسجد سے صبح اذان کی آواز

بلند ہورہی تھی ۔پرویز اور عقیل کو رُوتا بلکتا چھوڑ اِس عارضی دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناطہ توڑ گئی۔ دراصل رفیق زندگی کی دائمی جدائی کا غم فریدہ جی برداشت نہ کرپائی۔

والدین کی جُدائی کے بعد پرویز اور عقیل کی دنیا میں گھور اندھیرا چھا گیا۔ اُن کی ہمت ٹوٹ سی گئی۔۔۔۔اور اپنی بدبختی پر روتے رہے۔

ایک روز عقیل کالج کے لئے گھر سے چل پڑا۔ شام تک واپس نہیں آیا۔ ڈھونڈنے پر پرویز کو یہ جانکاری ملی کہ عقیل کالج نہیں گئے تھے۔۔۔۔پُر آشوب حالات میں لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ کسی نے کہا فورسز نے حراست میں لیا ہوگا۔ کوئی بولا سرحد پار کرلی ہوگی۔

پرویز نے پولیس، حفاظتی دستوں، تحریکی و عسکری ٹھکانوں سے رابطہ قائم کیا لیکن بے سُود۔ پرویز کی رہی سہی اُمیدین دم توڑ بیٹھیں۔

دن گُزرتے گئے۔ کسی نے پرویز سے کہا کہ عقیل کو بانڈی پورہ میں دیکھا گیا ہے۔ وقت ضائع کئے بغیر پرویز وہاں چلا گیا۔ لیکن ماسوائے مایوسی کے کچھ بھی ہاتھ نہیں لگا۔

تھک ہار کر پرویز پہاڑی کے دامن میں سڑک کے کنارے چائے خانہ میں داخل ہوا۔ گوشہ راست میں خالی کُرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیا چاہئے صاحب؟''

پرویز کے سامنے عقیل کی عمر کا لڑکا کھڑا تھا۔ اُسی کی طرح لمبے لمبے بال۔

''چائے لے آو اور مکی کی روٹی''

تھوڑی دیر میں لڑکا چائے لیکر آگیا۔۔۔۔اور اپنی بھیگی پلکیں کُرتے کے دامن

سے صاف کرنے لگا۔ اُس کے چہرے پر یاسیت بھرے نقوش صاف نظر آرہے تھے۔
۔۔۔پرویز کو لڑکے سے خاص اُنس ہوا۔۔۔۔اور پھر یہ جانکاری ملی کی وہ اوڑی کا رہنے والا ہے۔ والد اور بہن جانکاہ زلزلہ کی زد میں آگئے۔۔۔۔ پڑھائی چھوڑ کر اس چائے خانے میں نوکری کر رہا ہے تا کہ اپنے ساتھ ساتھ نابینا ماں کو پال سکے۔

اگلے روز پرویز چائے پینے آیا تو دیکھا چائے خانہ کا مالک رزاق کی مار پیٹ کر رہا ہے۔

''چھوٹا لڑکا ہے۔ تمہیں اِسے مارتے رحم نہیں آتا۔ آخر کیا قصور ہے اس کا۔

پرویز برجستہ غصے میں آکر کہہ گیا۔

''برتن صاف کرتے ہوئے دو پلیٹیں توڑ دیں۔ حرام
خور نہ جانے دھیان کہاں ہوتا ہے''۔

پرویز کی رگِ حمیت جاگ اُٹھی۔ رزاق کی طرف دیکھا جو برابر رو رہا تھا۔ دفعتاً پرویز نے رزاق کا ہاتھ پکڑا اور گرج دار آواز میں کہا

''رزاق چلو میرے ساتھ! تمہاری ظلمت بھری رات
کا خاتمہ ہو گیا۔ تمہاری غم زدہ زندگی میں خوشیوں بھرا
سویرا اُبھرنے کو ہے۔''

اور وہ دونوں ایک نئے جذبہ کے ساتھ چائے خانے سے باہر آگئے۔



گوا ہر گرانمایہ

عابدہ کے ساتھ باتوں کا سلسلہ کیا شروع ہوا کہ کامران کے تن من میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

عابدہ نے محبت نامہ کا جواب اُلفت بھرے لہجے میں کیا دیا کہ کامران کی چھوٹی سی نگری میں انبساط وشادمانی بسیرا کرنے لگی اور عابدہ جب سدا کے لئے کامران کی زندگی سے منسلک ہوگئی تو کامران خوشی سے پاگل ہونے لگا۔ جیسے اُسے قارون کا خزانہ ہاتھ لگا ہو۔

ابھی مشکل سے ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ عابدہ اور کامران خلاف توقع ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ بدگمانی و بدظنی کا ہدف بنے لحظہ بہ لحظہ اپنائیت وانسیت کی جگہ نفرت نے لینی شروع کردی۔ جیسے محبت کے جام چھلک کر خالی ہو گئے ہوں!

دیکھتے ہی دیکھتے کامران نے اپنی انا بچانے اور خفت مٹانے کی نیت سے جان پہچان والی محفلوں میں کچھ اِس طرح زبان وا کرنے میں اپنی عافیت جان لی۔

> ''ماننا پڑتا ہے کہ عورت مرد کی پرواز میں سب سے بڑی کوتاہی ہوا کرتی ہے۔ کاش داناؤں کی اِس نصیحت کو پہلے خاطر میں لایا ہوتا تو ایک سے دو بن جانے کی حماقت کبھی نہ کرتا''۔

اس کے برعکس جب راز دار سہیلی سلیقہ نے عابدہ کی رگ حمیت کو چھیڑا تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح سامنے منڈلانے لگی کہ کامران شادی سے قبل ہی مردانگی سے وابستہ گوہر گرانمایہ کو بدنام گلی کی کسی چوکھٹ کی نذر کر چکا ہے۔

موری کے کیڑے

حاجی محمد اکرم کے قالین بننے کے کارخانے کو اچانک آگ نے پوری طرح پر اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

آگ بجھانے والا عملہ انتھک کوششیں کرتا رہا لیکن وہ کارخانہ کو نہ بچا سکے۔ البتہ کارخانے سے ملحق حاجی صاحب کی چار منزلہ عالیشان کوٹھی بھی اپنے ہونے کا اعلان کر رہی ہے۔ اس لمبی چوڑی کوٹھی میں حاجی صاحب اپنی شریک حیات دو بچوں اور چند چاکروں کے ساتھ قیام پذیر ہیں۔ اس کوٹھی اور کارخانہ کے درمیان ایک جھونپڑا ہے جس میں حمالی پیشہ سے وابستہ احمد افراد خانہ کے ساتھ برائے نام زندگی کے ایام سختی میں کاٹ رہا ہے۔

فائر بریگیڈ عملہ نے حاجی صاحب کی نظرِ عنایت پاتے ہی کوٹھی کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ کوٹھی تو آگ سے محفوظ رہی۔ مگر المیہ یہ ہوا کہ احمد کے جھونپڑے کی جانب از راہ انسانیت کسی ایک نے آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ لاکھ جتن کرنے کے باوجود احمد جھونپڑے کو راکھ ہونے سے نہ بچا سکا۔

اگلے روز حاجی صاحب کی کوٹھی پر ایک بڑے جشن کا اہتمام کیا گیا۔ مبارک باد دینے والوں کا تانتا بندھا رہا۔۔۔ انشورنس ایجنٹ کے ساتھ ساتھ کچھ سرکاری کارندے

کارخانہ کے نقصانات کا تخمینہ لگانے کے لئے آ گئے۔ مہمانوں کے لئے طرح طرح کے پکوان تیار کئے گئے تھے۔

کارخانہ اور کوٹھی کے پاس ہی جلے ہوئے ملبہ کے ڈھیر پر احمد اپنی دل شکستہ بیوی اور چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں سمیت بے سروسامانی کی حالت میں پڑا تھا۔ کسی ایک نے اس لئے ہوئے گھرانے کے افراد کی طرف از راہ ہمدردی بھی نہیں جھانکا جیسے وہ آدم زاد نہیں بلکہ موری کے کیڑے ہوں۔



مشورہ

رام سرن متوسط گھرانے کا چشم و چراغ آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔غریبوں کے لئے اُس کے دل میں ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

اسکول آتے جاتے پیپل چوک کے نکڑ پر بیٹھی بھکارن کو وہ بلا ناغہ جیب خرچ میں سے ایک روپیہ دیا کرتا تھا۔ وہ دعائیں دیتی تو رام سرن مشفقانہ نظروں سے اُسے گھورتا۔

آج پچھلے دو دنوں سے بھکارن کو اپنی جگہ نہ پا کر رام سرن پریشان سا ہوا۔معلوم کرنے پر جانکاری ملی کہ وہ مندر والی سرائے میں بیمار پڑی ہے۔

اسکول سے فراغت پائے رام سرن سیدھے سرائے چلا گیا اور تھری ویلر میں بھکارن کو ڈاکٹر گیتا کے کلنک پہونچایا۔ڈاکٹر نے معائینہ کرنے کے بعد دوایاں لکھیں اور اپنی فیس طلب کی۔ بھکارن کے پاس کچھ ریز گاری تھی۔ وہ گن کے اور کچھ رقم اپنی جیب میں سے ڈالے فیس ادا کی گئی تو ڈاکٹر کی آواز گونجی۔

”بہت کمزوری ہے اِسے کھانے میں گھی، دودھ، انڈے اور پھل دیا کرو“

یہ سُنتا تھا کہ رام سرن بولا ”ڈاکٹر صاحب جن لوگوں کو دال روٹی مشکل سے میسر ہوتی ہے وہ یہ سب چیزیں کہاں سے لائیں۔ پھر بھی آپ کے مشورہ ے کے لئے بہت بہت شکریہ“۔



اپنائیت کا صلہ

والدین کی بے وقت رحلت کے بعد نسرین دو چھوٹی بہنوں اور چھوٹے بھائی کا واحد سہارا رہ گئی تھی۔ ماں کی آخری خواہش کے بموجب اُس نے بہنوں اور بھائی کی زندگیوں میں بشاشت کا رنگ بھرنے کی نیت سے تعلیم کو خیر باد کہے جگہ جگہ نوکری حاصل کرنے کی تگ ودو کرلی تا کہ اپنے سمیت چار نفوس کو پال سکے۔ لیکن کسی ایک نے ازراہِ مُروت نسرین کی جانب دست تعاون دراز کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ بلکہ جس کسی کے روبرو اُس نے اپنی روئیداد دُھرائی اُسی نے نسرین کی مجبوری کا فائدہ اُٹھانا چاہا۔

نسرین چاہتی تھی کہ بہنیں اور بھائی پڑھ لکھ کر اعلیٰ مقام حاصل کرلیں۔ اس خواہش کو پورا کرنے کی خاطر نسرین کو وہ لباس زیب تن کرنا پڑا جس کو چھونا بھی اُس کو گوارا نہ تھا۔ الغرض تھک ہار کر فقط بھائی بہنوں کے مستقبل کو درخشاں دیکھنے کی غرض سے نسرین نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا۔

وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔ بہنیں اور بھائی پڑھ لکھ کر برسرِ روزگار ہوئے اور ازدواجی زندگی کی دہلیز کو چھونے میں کامیاب ہوگئے۔ سارا خرچہ نسرین نے برداشت کیا۔۔۔ ایرے غیرے سے اصلیت جان کے انہوں نے نسرین کے احسانات وقربانی کو خاطر میں نہ لائے اُس سے کنارا کشی اختیار کرنے کو ترجیح دی۔

لے دے کے عمر ڈھلتے ہی نسرین کو اُداسی و مایوسی کے بحر بے کراں میں غرق بے سہارا ہونا پڑا۔جن کی بھلائی اور خوشی کے لئے اُس نے اپنی جوانی، اپنی زیست اور اپنی اُمنگوں کو داؤ پر لگا دیا وہی اُسے اپنا حریف گردانتے لگے۔

اور اب جبکہ بہن بھائی اپنے اپنے گھروں میں عیش اور سکون کے ساتھ زندگی گذارنے میں محو ہیں نسرین بڑھاپے کے عالم میں یتیم خانہ کی چوکھٹ پر بے سروسامانی کی حالت میں جی رہی ہے۔اُس کا کوئی پُرسان حال نہیں۔



کڑوا سچ

''تم شادی کیوں نہیں کرتے'' ریاض نے مسرور سے پوچھا

''کیا کروں کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی''، مسرور نے جواب دیا۔

''کیوں! کیا شہر سرینگر میں خوبصورت لڑکیوں کا کال پڑا ہے''

ریاض نے شوخی سے پوچھا۔

''کیا کروں لڑکی اگر خوبصورت ہے تو خوب سیرت نہیں ہوتی۔ اور اگر خوب سیرت ہوتی ہے تو کوئی نہ کوئی نقص ہوتا ہے کبھی رنگ کالا، ہونٹ موٹے یا قد میں فرق''

'' برخوردار یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ تمہاری عمر چالیس سال سے زیادہ ہے'' ریاض نے لُقمہ دیا

کچھ ہفتوں بعد ریاض کی پہل پر مسرور کو فیروزہ نامی لڑکی دِکھائی گئی۔ نہایت خوبصورت اور متوازن خدوخال کی مالکہ یہ جان کر کہ لڑکی گریجویٹ ہے اور گھریلو اُمورات میں ماہر مسرور نے حامی بھرلی۔ عین اُس وقت جب کہ ریاض نے مٹھائی کا ڈبہ کھولنا چاہا فیروزہ کے والد نے زبان وا کی۔

''ہاں تو مسرور بیٹے اپنی بابت زرا تفصیل سے جانکاری دو''

''پڑھا لکھا ہوں، اور پرائیویٹ فرم میں مینجر
ہوں۔ پانچ ہزار روپے مشاہرہ پاتا ہوں۔۔۔ گھر میں
ماں اور چھوٹی بہن ہے''۔

''یہ تو ٹھیک ہے جائیداد، بینک بیلنس کی بابت کچھ بتائے۔''

''اس بابت قابلِ ذکر کچھ نہیں۔ ویسے آپ کو میرے
سے زیادہ میری دولت اور جائیداد سے دِل چسپی کیوں
ہے؟''

مسرور برجستہ انداز میں کہہ گیا۔

''برخوردار ہماری لڑکی میں کوئی بُرائی یا عیب نہیں۔
اِس اُدھیڑ عمری میں اٹھاراں سالہ لڑکی کا ہاتھ مانگنے آئے
ہو۔۔۔ زمین جائیداد سے محروم ہو اور پھر بہن کی شادی
کے اخراجات بھی تم کو ہی برداشت کرنے ہیں۔۔۔۔
ان حالات میں ہماری بیٹی کو کون سی خوشی دو گے۔۔۔
نہیں ہم اپنی بیٹی پر یہ بڑا ظلم نہیں کر سکتے۔''

یہ کہہ کر فیروزہ والدین کے ساتھ چلی گئی اور کڑوا سچ سُن کر مسرور کے چہرہ پر
اُداسی چھا گئی۔ وہ اور اُس کی ہستی ڈگمگانے لگی۔



تارکول کا ڈرم

عیدہ گاہ طرح طرح کے لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ نمازِ عید شروع ہونے میں صرف چند گھڑیاں باقی تھیں۔ نئے اجلے اور بھڑکیلے لباس میں ملبوس لوگ احترام سے صفوں میں براجمان پیش امام کی تمہیدی تقریر سننے کے لئے بے تاب تھے۔ کچھ لوگ خلاف توقع آپس میں مختلف موضوعات پر باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ کچھ کی نگاہیں سامنے رکھے ہوئے جوتوں پر مرکوز تھیں۔ جوتوں، سلیپروں اور چپلوں کے تلوے ملے ہوئے تھے اور صفوں کے سامنے سجدے کی جگہ سے ایک اِنچ آگے رکھے ہوئے تھے۔ کچھ نمازی دلہن کی طرح سجائے بچے اپنے ساتھ لائے تھے۔

مولوی صاحب کی صحت قابلِ رشک تھی۔ مائیکروفون اگر نہ بھی ہوتا تو بھی ان کی گرج دار آواز آخری صف تک ضرور پہنچ جاتی۔ ان کی تقریر کا نفس مضمون کچھ اس طرح کا تھا۔

"دین اسلام مساوات اور رواداری کا علمبردار ہے۔
اللہ کے حضور سب کے سب برابر ہیں۔ کسی عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت نہیں۔۔۔۔ اسلام نے امیر و غریب، گورے و کالے اور رنگ و نسل کی تمیز ختم کر دی

ہے۔ دولت، عہدہ یا مرتبت کی بنیاد پر کسی ایک کو فضیلت
ملنے والی نہیں! پروردگار کو فقط تقویٰ و پرہیزگاری پسند
ہے۔۔۔۔"

آخری صف میں براجمان سیاہ فام شخص اچانک اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایک دراز قد نوجوان تھا۔ آنکھیں روشن، لیکن اندر کو دھنسی ہوئی اور چہرہ سپاٹ، اس کے لباس میں جا بجا پیوند لگے ہوئے تھے۔ زندگی کا بوجھ اُٹھاتے اور سہتے اس کی ریڑھ کی ہڈی کمان کی طرح خم دار ہو گئی تھی۔ غیر ارادی طور پر وہ آگے بڑھا۔

"بیٹھ جاؤ کالے"۔ ایک دبلے پتلے شخص نے سیاہ
فام کا بازو تھامتے ہوئے کہا
"ابے کیا بندریا تلاش کر رہا ہے"

سیاہ فام شخص نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ ساتھ ہی وہ اگلی صف میں کھڑا ہونے کے لئے آگے بڑھا۔

"دور ہٹ یار" بھاری بھرکم شخص نے اس کو دھکیلتے ہوئے کہا۔
"تو آدمی یا تارکول کا ڈرم"

سیاہ فام شخص خاموش رہا اور خاموشی سے اس صف سے نکل کر اگلی صف میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

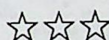
"اوہو! بڑے ہی احمق ہو"۔ ایک عمر رسیدہ شخص نے
بہت ہی غصے سے کہا "شرم نہیں آتی! اپنا غلیظ پاؤں
میرے اجلے سلیپر پر رکھ دیا"۔

سیاہ فام شخص نے عمر رسیدہ بزرگ کے غصے کو نظر انداز کر دیا اور اس صف سے بھی نکل کر اگلی صف میں پہنچ گیا۔

پاس والے خوش باش شخص نے نفرت کی نظروں سے گھور کے اچک کر اپنا جوتا اُٹھایا۔ اور اگلی صف میں چل دیا۔ ساتھ ہی اس کی زبان بھی چلنے لگی۔

''ابے بد بخت! بندگی میں بھی روڑے اٹکاتا ہے''

اتنے میں الصلواۃ کے ساتھ لوگ کھڑے ہو گئے۔ اور ''اللہ اکبر'' کی اونچی آواز کے بعد نماز عید شروع ہو گئی۔ سیاہ فام شخص بت بنا کھڑا سوچتا رہا کہ مولوی صاحب کی اسلامی قدروں سے لبریز باتوں کو لوگ اس سُرعت کے ساتھ کیوں کر فراموش کر گئے۔۔۔؟



میرے اپنے

کب سوچا تھا کہ بگڑا مقدر ایسا کھیل بھی کھیلے گا۔ ساری زندگی روزی روٹی کی بھاگ دوڑ، رات ودن کی جدوجہد اور کبنہ کی پرورش کی تگ ودو میں بیت گئی۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ اتنا طویل عرصہ کیسے گذر گیا۔

سوچا تھا کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد فرصت کا مزہ لینگے اور زیست کے باقی ماندہ ایام آرام سے بتائیں گے۔ رٹائرمنٹ کے کچھ ماہ بعد اچانک ہی تکلیف ہوئی۔ مقامی ہسپتال میں معائینہ کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ گردوں نے کام کرنا بند کردیا ہے۔ اور کم از کم ایک گردے کا ٹرانس پلانٹیشن (Transplantation) تو کروانا ہی پڑے گا۔ اس کے بغیر کوئی علاج نہیں۔ نہ جانے اس بُڑھاپے میں کن بُرے کاموں کا بدلہ ملا۔ زندگی یک لخت جہنم سی بن گئی ہے۔

افراد خانہ میں پھسپھساہٹ شروع ہوئی۔ آخر گردہ دستیاب ہو تو کہاں سے۔ بڑے بیٹے کی رگوں میں رواں خون نے جوش مارا۔ اُس نے اپنا ایک گردہ دینے کی بات منہ سے نکالی ہی تھی کہ بہورانی نے رو رو کر بُرا حال کیا۔ اپنی اور بچوں کی قسمیں دے ڈالیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مائیکے سے اپنے والدین کو بُلوایا اور بڑا بیٹا گردہ نہ دینے پر مجبور ہوا۔

منجھلی بہو نے تو دوٹوک بات کہی کہ جب بڑے بھائی صاحب گردہ نہیں دے

رہے ہیں تو ہم ہی کیوں دیں۔ ہم بھی تو بال بچوں والے ہیں۔

چھوٹا بیٹا ابھی کنوارا ہے ماں کا لاڈلا بھی۔ اُس کی طرف سے اُس کی والدہ کہہ اُٹھی۔

''اس کے تو ابھی کھیلنے کھلانے کے دن ہیں۔ اُس
نے اپنا گردہ دے دیا تو کل اُسے اپنی لڑکی کون دے گا۔''

بچاری عورت کیسے اُلجھن میں پھنس جاتی ہے۔ شوہر اور بیٹے میں کسے فضیلت دے۔ آخر اپنے پیٹ جائے کا پلڑا بھاری پڑ گیا۔

اب لے دے کے اپنائیت کا مظاہر کرتے ہوئے اخباروں میں اشتہار دیئے جا رہے ہیں۔ سُنا ہے کہ ڈیڑھ لاکھ میں گردہ مل جائے گا۔

اب یہ خیال بری طرح ستانے لگا ہے کہ ریٹائرمنٹ پر ملی بڑی رقم مکان کی دوسری منزل اور باہری غسل خانہ تعمیر کرنے پر صرف کرنے کے بجائے اپنے پاس ہوتی تو یہ لاچاری کے ایام نہ دیکھنے پڑتے۔



سراب

جاوید کو شہر کا ہر دل عزیز مُصور گردانا جاتا ہے۔ دراصل والدین کی حادثاتی موت نے جاوید کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی۔ کہاں چنچل طبیعت لئے ہر وقت زندہ دِلی سے ہر ایک کے ساتھ پیش آنا اور کہاں اب اتنا سنجیدہ کہ کسی ایک سے کُھل کر بات بھی نہیں کرتا۔

سدا خیالی دنیا میں کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ اور زیادہ تر تصویریں بنایا کرتا ہے۔ حسین اور دل آویز تصویریں۔ ہر خوبصورت شئے یا ہستی کو کنواس میں مقید کرنے کے خواب دیکھا کرتا ہے۔

جاوید کے کوارٹر کے مقابل کوٹھی کب سے خالی پڑی تھی اور آج آباد ہوگئی۔ ٹھلیا رمضان کی زبانی جانکاری ملی کہ ایک میجر صاحب نوکری سے سبکدوش ہونے کے بعد اس بنگلہ میں رہنے آئے ہیں۔ ساتھ میں اُن کی شریک حیات، ماں اور ایک بیٹی ہے۔

جاوید نے کمرہ شب باشی کے پچھواڑے کی کھڑکی کیا کھول دی کہ دیکھتا رہ گیا۔ سامنے دالان میں کرسی پر بیٹھی ایک زندہ مورت نظر آئی بے حد خوبصورت چہرہ، لمبے بال اور آنکھوں پر کالی عینک چڑھی ہوئی۔

حسب عادت جاوید نے اُس کی تصویر بنانی شروع کی۔ اب تو شام کو بسا اوقات وہ کھڑکی کے پٹ کھولے مورتی کی صورت دیکھنے کے لئے بے قرار رہتا۔

کچھ ہفتوں کی ریاضت کے بعد تصویر مکمل ہوگئی۔

ایک روز جبکہ جاوید دفتر سے واپس آیا تو رمضان نے ایک لفافہ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ''میجر کی لڑکی کی سالگرہ تھی اور اُسے دعوت میں بُلایا ہے'' جاوید نے موقع غنیمت جان لیا۔ مقررہ دن تصویر کو کاغذی غلاف میں مُقید میجر کے گھر گیا۔

تصویر کی نقاب کُشائی کرنے کے ساتھ ہی میجر صاحب چِلائے

''اُف کس قدر حسین اور دیدہ زیب تصویر۔ ہُو بہُو ہماری قُدسیہ جیسی''

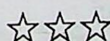
''یہ قُدسیہ کے لئے میرا تحفہ سمجھئے'' جاوید بے تامل کہہ گیا۔

''مگر وہ اِس تحفہ کا کیا کرے گی'' میجر کی بیوی نے لقمہ دیا

''آخر کیوں؟'' جاوید حیرانی کے عالم میں بولا۔

''وہ تو اندھی ہے'' میجر نے مری مری آواز میں کہا

''یہ سننا تھا کہ جاوید کے ہاتھوں سے تصویر فرش پر گر گئی۔ اور شیشے کی کرچیں دیکھتے ہی دیکھتے جاوید کے خوابوں کو ریزہ ریزہ کرگئی۔



رغبت

شریک زیست کی حادثاتی موت کے بعد لوگوں کا منہ بند کرنے کی خاطر سوتیلی ماں نے شگفتہ کی بھرپور جوانی کا اچھے داموں سودا کر دیا۔ رفیق زندگی دِلاور پہلوان بھاری بھرکم شخصیت کے مالک تھے اور اول درجہ کے عیاش و شرابی۔

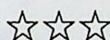
خدا کا کرنا کہ شادی کے کچھ مہینہ بعد ہی دِلاور دائمی نیند سوکر شگفتہ کو بے آسرا کر گیا۔ ازدواجی زیست کی دہلیز کو چھونے پر شگفتہ کی زندگی کا جو مستی بھرا پہلو روشن ہوا تھا دیکھتے ہی دیکھتے وہ گھپ اندھیرے میں نیست و نابود ہو گیا۔ الغرض عین عالم شباب میں قدرت نے شگفتہ کو ازدواجی زیست سے وابستہ لذات سے محروم کر دیا۔

شگفتہ میٹرک تک پڑھی تھی اور تھوڑی بہت تگ و دو کرنے کے بعد مقامی زنانہ اسکول میں اُستانی کی جگہ مل گئی۔ البتہ وہ جنسی خواہشات کے طوفان کو باوجود لاکھ کوشش کے نہ روک سکی۔ ویسے بھی یہ اصلیت اپنی جگہ اٹل کہ اگر کسی ندی کا باندھ سیلابی دباؤ سے ٹوٹ جائے تو باہر سے ہر طرح کی مرمت کرنے کے باوجود پانی کا رکنا محال ہو جاتا ہے۔ پانی کے مکمل روک تھام کے لئے سب سے لازمی چیز تو اندرونی شگاف کو پاٹنا ہوتا ہے۔

اس آڑے اور نازک وقت میں شگفتہ کو کوئی نیک صحبت نہ مل سکی جو کم از کم اُس کے جذبات بھرے خیالات میں متوازن تبدیلی پیدا کر دیتی۔ یہی وجہ تھی کہ شگفتہ نے اپنے

جذباتِ نفس کی تسکین کے لئے اِدھر اُدھر جھانکنا شروع کر دیا۔ اسکول کی بوڑھی و تجربہ کار خادمہ رحیمن بی نے شگفتہ کی بے قراری بھانپتے قصبے کے شریف افراد سے اُس کی شناسائی کرائی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں شگفتہ اس حلقہ میں کافی مقبول ہوئی اور بظاہر اطمینان وسکون کی زندگی گزارنے لگی۔

وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔ عُمر ڈھلتے ہی شگفتہ کی ہر دلعزیزی بھی گھٹتی گئی اور اب اُس کا یہ جنسی شغل محض اسکول کی جوان و خوبصورت لڑکیوں سے رغبت پیدا کرنے تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔



مُخبر

سرِشام ہی آس پاس کی مسجدوں کے میناروں پر نصب لوڈ اسپیکروں کی وساطت مکمل ہڑتال کرنے کی آوازیں فضا میں گونجیں!

آن واحد میں دکانیں بند، ٹرانسپورٹ معطل اور بازار سنسان نظر آنے لگا۔ پوچھ تاچھ پر یہ اصلیت سامنے آگئی کہ ایک علحیدگی پسند زعیم کے دُور کے رشتہ دار کو کسی نامعلوم بندوق بردار نے کارخانے سے گھر واپس آتے گولیوں کو نشانہ بنایا۔ ہلاک شدہ شخص کی بابت یہ بھی جانکاری ملی کہ کچھ ماہ پہلے تک وہ عسرت وافلاس کی زندگی گذار رہا تھا اور پھر نہ جانے اُسے کہاں سے بے حساب دولت ملی کہ شاندار کوٹھی، موٹر کار اور سیمنٹ کارخانے کا مالک بن بیٹھا۔

پندراں سالہ محبوب گاؤں سے شہر اپنی خالہ زاد بہن کو ملنے آیا تھا اور کھل بھلی و افراتفری کے عالم میں ''ڈاون ٹاون'' نہ جاسکا۔ اور اپنی جان بچانے کی خاطر میونسپل شڈ میں جا چُھپا۔ مزید خون خرابہ روکنے کی غرض سے شہر بھر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کیا گیا۔ ڈر اور خوف کے مارے محبوب کو شڈ میں ہی رات گذارنی پڑی۔ سویرے بھوک پیاس نے اُسے تنگ کیا۔ گھبراہٹ کے عالم میں شڈ سے باہر جھانکا ہی تھا کہ ''ہالٹ'' کی گرجدار آواز نے چونکا دیا۔ محبوب کی حالت ابتر تھی روتے روتے اُس نے ہاتھ اوپر کیے۔ دو وردی پوش

نمودار ہو گئے۔ حقیقت حال سے باخبر ہونے پر اُنہوں نے محبوب کو دِلاسہ دیا اور اپنے ساتھ بینکر میں لایا، کھلایا پلایا، اور پھر متعلقہ علاقے کی پولیس چوکی کے حوالے کر دیا۔ تاکہ محبوب بہن کے گھر جا سکے۔

پولیس والوں نے اپنی جیپ میں بٹھا کر محبوب کو علاقے کی بڑی گلی کے نکڑ پر چھوڑا۔ تنگ گلی میں محبوب نے ابھی کچھ قدم ہی بڑھائے تھی کہ گوشۂ راست سے گولیاں چلیں اور دیکھتے ہی دیکھتے محبوب وہیں ڈھیر ہو گیا۔ گو پولیس والوں نے گولیوں کی آواز سُن کر پیچھا کیا لیکن بندوق بردار بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

محبوب کی خالہ زاد بہن راہیلہ و دیگر رشتہ دار اور محلے کے مکین اِس جانکاہ حادثہ پر زار و قطار روئے، ساری بستی میں ماتم کا سماں بندھ گیا۔ لوگ طرح طرح سے لواحقین کو دلاسے دینے لگے۔ اِتنے میں ایک ریش دراز شخص بھیڑ کو چیرتے سامنے آ کے کہنے لگا۔

"ارے یہ لڑکا دراصل مُخبری کا کام کرتا تھا۔ میں نے
اُسے خود ملڑی کی جیپ سے اُترتے دیکھا ہے"

یہ سُننا تھا کہ لوگ ایک ایک کر کے اپنے گھروں کو جانے لگے اور لے دے کے اب محبوب کی لاش کے پاس اُس کی بہن اور قریبی رشتہ دار ہی رہ گئے۔ گویا ایک اور بے قصور کو مُخبری کی آڑ میں دائمی نیند سُلا یا گیا۔



کباڑیا

لال دین ایک کباڑیا تھا

دن بھر ٹوٹا پھوٹا سامان، ردی کاغذ، ناکارہ ٹین اور پُرانے اخبارات گھر گھر جا کے جمع کرتا اور شام کو دکاندار کو فروخت کر کے برائے نام رقم وصول ہوتی۔ بیوی بچوں کے ساتھ مشکل سے گذارا ہوتا تھا۔

کچھ برس گذرنے کے بعد لال دین کی کایا اچانک پلٹ گئی۔ دولت اُس کے قدم چومنے لگی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی خستہ جھونپڑی ایک عالیشان کوٹھی کا روپ دھار گئی۔ ہر طرح کا سُکھ لال دین کو حاصل ہے۔

دراصل اب لال دین آفیسروں، بیروکریٹوں اور منسٹروں کے بنگلوں کے چکر لگایا کرتا ہے۔ جہاں خالی کئے ہوئے قیمتی بریف کیس مٹی کے مول ملتے ہیں اور وہ بازار میں اُن کو اچھے داموں فروخت کر لیتا ہے۔



ہمدردی کی آڑ میں

یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب میں سرکاری ملازمت کے سلسلے میں بٹوت میں قیام پذیر تھا۔ سُدھ مہادیو کا سالانہ عرُس شروع ہوا جو برابر ہفتہ بھر جاری رہتا ہے۔ اس میلہ میں ہزاروں کی تعداد میں ریاستی اور غیر ریاستی لوگ شوق سے شرکت کرنے آتے ہیں۔ چوبیس گھنٹے عقیدت مندوں سے بھری گاڑیاں پہاڑی راستوں پر چلتی رہتی ہیں۔ اگلے روز صبح سے ہی بوندا باندی ہوتی رہی۔۔۔۔ باد و باران کی وجہ سے سواریوں سے بھری ایک گاڑی کا ڈرائیور کنڑول کھو بیٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے بس چیڑ کے درخت سے ٹکرائے گہرے کھڈ میں جا گری۔

کئی لوگ موقع پر ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، لاشوں کو چھوڑ زخمیوں کو علاج و معالجہ کی خاطر ہسپتال لے جانے کو ترجیح دی گئی۔ مجھے بھی دیگر اراکین کے ساتھ سرکاری گاری میں جائے واردات تک جانے کا موقع ملا۔ ہر طرف تباہی اور ویرانی کا سماں طاری تھا۔ لاشوں کو اُٹھا رہے تھے کہ عقب میں کراہنے کی آواز نے چونکا دیا۔ ایک خاتون تھی جِسے غالباً مُردہ تصور کئے چھوڑ دیا گیا تھا۔

ہم نے گاڑی میں خاتون کو ہسپتال لایا۔ راستہ بھر وہ بے ہوش پڑی رہی۔ البتہ سانس چل رہی تھی۔ اُس کے بائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی کٹی ہوئی تھی اور زخم سے خون

بہہ رہا تھا خاتون کو ہسپتال میں چھوڑ کر میں کوارٹر میں واپس آیا جہاں رفیقہ حیات میری منتظر تھی۔

علیٰ الصباح مُتذکرہ خاتون کا حال جاننے کی غرض سے ہسپتال گیا۔ اُس کی حالت قدرے بہتر تھی۔ باتوں باتوں میں کٹی ہوئی اُنگلی کی بابت اِستفسار کیا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو سما گئے اور درد بھری آواز میں کہا۔

''بتاؤں کیا بیٹا! آپ لوگوں کے آنے سے قبل کچھ افراد آگئے اُنہوں نے افراتفری مچائی۔۔۔ زیورات لوٹے۔۔۔ میں حیرت ناک مناظر دیکھ کر ہوش کھو بیٹھی۔۔۔ اِتنے میں دھچکے کے ساتھ مجھے ہوش آیا دیکھا ایک نوجوان میری انگلی سے انگوٹھی کھینچ رہا ہے۔ میں نے بہ مشکل تمام اُسے کہا ''بیٹے پہلے مجھے مرنے دو! پھر انگوٹھی اُتار لینا''

اِتنے میں کچھ لوگوں کا شور نزدیک سے سُنائی دیا تو اُس نوجوان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور دفعتاً جیب سے چاقو نکالے پیتل کی مُندری کی خاطر میرے ہاتھ کہ اُنگلی قلم کردی۔



برقع پوش

بھلا ہو اِس برقع کا

پرسُوں دفتر سے نکل کر بھرے بازار سے گذر رہا تھا کہ سامنے بڑے چوک کی نکڑ پر لوگوں کی بھیڑ دیکھنے کی ملی۔ حقیقت حال سے باخبر ہونے کی خاطر آگے بڑھا ایک وجیہہ اور خوب رو جوان برقع پوش خاتون کو اپنی منگیتر جِتا رہا تھا ساتھ ہی دوسرے شخص کا دعویٰ کہ خاتون اُس کی بیوی ہے۔ دونوں میں تُوں تُوں میں میں ہوتی رہی اور لوگ تماشہ دیکھنے میں مشغول، اتنے میں ایک عمر رسیدہ شخص خاتوں سے مخاطب ہوا۔

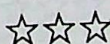
''بیٹی ذرا تم ہی معاملے پر روشنی ڈالو! آخر اصلیت کیا ہے؟''

یہ سُننا تھا کہ برقع پوش خاتوں بپھر سی گئی اور نفرت آمیز لہجے میں زبان وا کر دی۔

''ان دونوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں''

یہ کہہ کر اُس نے برقع کا اگلا پٹ اُلٹ دیا اور دونوں جوانوں پر جیسے بجلی گِری۔ وہ ایسے غائب ہو گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

متذکرہ خاتون کانی تھی اور اُس کا چہرہ چیچک کے داغوں سے لبریز!



شناختی کارڈ

تحریکی زعیم کو گرفتار کرنے کے بعد ماحول میں افراتفری اور سراسیمگی کے نقوش واضح انداز میں اُبھرنے لگے۔ حالات نہایت ہی کشیدہ۔۔۔ دو دنوں سے ہڑتال چل رہی تھی کچھ جوانوں نے دِل کا غبار نکالنے کی چاہ میں فورسز پر پتھراؤ کیا اور سرکار کے خلاف نعرے بُلند کیئے۔ نتیجے میں پتھروں، لاٹھیوں اور آنسو گیس کا بے تحاشا استعمال ہوا۔

خورشید کو فون پر اِطلاع ملی کہ اُس کا چھوٹا بھائی توفیق زخمی حالت میں اسٹیٹ ہسپتال میں پڑا ہے۔ خورشید نے اسکوٹر سٹارٹ کیا اور ہسپتال کی جانب پریشانی کے عالم میں چل پڑا۔ بائی پاس پر فورسز کے جوان ''شناختی کارڈ'' چیک کر رہے تھے۔ خورشید کارڈ گھر میں چھوڑ آئے تھے۔ اصلیت کیا بتا دی کہ اُسے قریباً تین گھنٹے تک حراست میں رکھا گیا اور پھر مقامی پولیس سب اسٹیشن کے حوالے کیا گیا۔

خورشید نے چوکی آفیسر کو حقیقت حال سے آگاہ کیا تو اُنہوں نے ڈرائیور کو ہدایت دی کہ خورشید کو اُن کے گھر چھوڑ آؤ۔

توفیق کی لاش ہسپتال سے آگئی تھی اور خورشید سر پیٹ کے بلک بلک کر رویا جب اُسے علم ہوا کہ توفیق نے جان دیتے وقت اُسے خوب یاد کیا تھا۔

اتنے میں خورشید کی نظر تپائی پر پڑے ''شناختی کارڈ'' پر پڑی اور اِضطرابی کیفیت میں اُس کے پُرزے پُرزے کر دیئے۔ گویا اپنا سارا غصہ بے جان شئے پر اُتار دیا۔



دُوسرا رُوپ

پُشپا محکمہ آبپاشی میں اِسٹینو کے فرائض انجام دے رہی ہے۔ دفتر کے اکثر اراکین اُس کے بے مثال حُسن اور متوازن خدوخال پر فریفتہ ہونے لگے۔ چھوٹے صاحب کشور کمار خاص طور سے پُشپا میں ضرورت سے زیادہ دل چسپی لینے لگے۔ وہ دن میں کئی بار ڈکٹیشن لینے کے بہانے اُسے یاد کرتے۔ لحظہ بہ لحظہ دونوں ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہنے لگے اور تو اور کشور کمار کے دل میں آرزو جاگ اُٹھی کہ وہ پُشپا کو جیون ساتھی کے طور چُن لے۔

ابھی وہ اِس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک شام لنگوٹیے یار ماسٹر پرویز نے دادِ عیش دلوانے کی غرض سے کشور کمار کو جہلم کے کنارے ''بیوٹی کوین'' نامی ہاوس بوٹ کی سیر کرائی۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ اِردگرد کی بستی نیند کی آغوش میں جانے کے بعد بدنام کوٹھے آباد ہوتے ہیں۔

پرویز نے کیبن تک ساتھ دیا۔ خفیف سی روشنی کیبن کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ کشور کمار نے اِردگرد کا بغور جائزہ لینا شروع کیا اور دفعتاً اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

سامنے پلنگ پر نیم عریاں لباس میں ملبوس پُشپا شانِ بے نیازی کے ساتھ اُسے گھور رہی تھی۔



سفید خون

لیٹروں نے سردار کے کہنے پر نواب فیروزالدین کے اکلوتے فرزند بختیار کو اِسکول سے واپسی پر اغوا کرلیا۔ سردار بہت ہی مسُرور نظر آرہے تھے۔ جانتے تھے کہ دولت منداور نامی گرامی باپ کے بیٹے کے عوض اُن کو منہ مانگی رقم مل سکتی ہے۔ اس خوشی کے موقع پر بڑے کھانے کا اہتمام کیا گیا۔۔۔۔ ساتھیوں کے ساتھ داد عیش لینے کی نیت سے شراب کی محفل سجائی گئی اور پھر گُل بدن کے نیم عریاں رقص سے سب کے سب محظوظ ہونے لگے۔۔۔۔ انبساط بھرا یہ دور رات گئے تک جاری رہا۔

نشہ کافور ہونے پر سردار نے صبح سویرے خوشی خوشی موبائیل پر نواب صاحب کا نمبر گھمایا

نواب صاحب نے خود ہی فون اُٹھایا۔

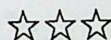
" آپ کا بیٹا بختیار ہماری حراست میں ہے۔ اُس کی رہائی کی خاطر دُو لاکھ کی رقم لیکر شاہی باغ کے چبوترے میں رات کے نو بجے آجائے۔ پولیس کو خبر نہ کریں۔ ورنہ پچھتاوگے"

کچھ توقف کے بعد نواب کی آواز گونجنے لگی۔

"بندہ پرور: آپ کو مطلوبہ رقم مل جائے گی البتہ شرط
یہ ہے کہ بختیار کی زندگی کا خاتمہ کر دو"

سردار اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ تذبذب کی حالت میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اُس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات کے دھارے پھوٹنے لگے۔۔۔ آخر بختیار کی موت سے نواب صاحب کو کیا حاصل ہوگا۔۔۔ کیا وہ اُس کا سگا بیٹا نہیں۔۔۔ آخر اصلیت کیا ہے؟

اس کے بعد اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے سردار ابراہیم نے بختیار کو صحیح سلامت اُس کے گھر پہنچا دیا۔



سرکار کا خیر خواہ

صندوق کتابوں کی وجہ سے بوجھل معلوم ہو رہا تھا۔ باجی کے اصرار پر ارشاد نے جموں ریلوے اسٹیشن پر سامان کا وزن کرانا چاہا لیکن لنگوٹیے یار نریندر برس پڑے۔

"ارے ڈرپوک کیوں گھبراتے ہو، تم تو طالب علم
ہو۔ اور پھر صندوق میں کتابیں ہی تو ہیں۔ وزن تھوڑا
زیادہ ہو تو کوئی مضایقہ نہیں"

گاڑی تیز چل رہی تھی۔ اور ارشاد سوچ رہا تھا کہ اگر سامان کا وزن کرایا گیا تو لینے کے دینے پڑینگے۔ رات دیر گئے علی گڈھ اسٹیشن پر ریل گاڑی رُک گئی۔۔۔۔ اِرشاد نے قلی کو صندوق، اٹیچی تھمادی اور بستر بندھ ہینڈ بیگ لیکر اسٹیشن سے باہر آنے لگا۔

"ٹکٹ دِکھایئے" سفید وردی پہنے ٹکٹ چکر سامنے کھڑا تھا۔

ارشاد نے ٹکٹ اُس کے ہاتھ میں تھمادی

"آپ کے سامان کا وزن زیادہ لگتا ہے"

"ہاں کچھ زیادہ ہے، البتہ صندوق میں سوائے کتابوں کے کچھ نہیں ہے۔"

ارشاد نے عاجزی کیساتھ جواب دیا۔

"لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ گورنمنٹ کا نقصان

ہو۔ کتابیں چھوڑ اگر صندوق میں مٹی بھی بھر دو بھاڑا دینا پڑے گا۔"

خیر وزن کرانے پر ٹکٹ چکر کچھ توقف کے بعد بولے

"ڈیڑھ سو روپے بنتے ہیں"۔۔۔اس کے بعد دیر تک ریلوے کے قواعد سمجھاتا رہا۔ پھر اِرشاد کے قریب جا کر رازدارانہ انداز میں زبان کھولی۔

"اچھا تو ایک سو روپے دو۔ اُس صورت میں رسید نہیں ملے گی۔" ارشاد سوچنے لگا کہ ایک سو روپے دوں تو اِس حرام خور کو ساری رقم ہڑپ کرنے کا موقع ملے گا۔ دفعتاً اُس نے ڈیڑھ سو کی رقم چیکر کے ہاتھ میں تھما دی۔

"رسید دیجئے"

"ارے بابا ناراض ہو گئے۔ چلو اسی روپے ہی دیدو"

"نہیں مجھے پوری رقم کی رسید چاہئے" اِرشاد نے تلخ لہجہ اپنایا۔

رسید لے کر اِرشاد ایک فاتح کی طرح اسٹیشن سے باہر آیا اُس کے ماتھے پر اطمینان وسکون کے آثار نمایاں تھے۔



تضاد

اِقبال خوش حال گھرانے کا یار باش اور خوب رُو نوجوان تھا۔ اُسے دُوستوں سے خلوص سے پیش آنے اور اُن کے ساتھ گپیں مارنے میں سکون ملتا تھا۔

یار دوستوں کی ہر طرح سے دِل جوئی کرنے میں اُسے اطمینان حاصل ہوتا تھا۔ جس دن نیا دوست یا ساتھی بنا لیتا تو اقبال کو ایسا لگتا کہ اپنی ویران زندگی کے ایک خلا کو پُر کر لیا ہے۔

اقبال کے دوست یوں ہر طبقہ، ہر فرقہ اور ہر قسم کے لوگ تھے۔ خوبصورت، اوسط درجے کے حسین اور بدصورت بھی تمام دوستوں کی خاطر مدارات کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ ہر وقت اور ہر حال میں دوستوں کی صحبت اپنانا اور پھر طرح طرح کی باتوں میں مشغول رہنا اُس کا معمول بن چکا تھا۔ برتری کا احساس سوار ہوتا تو اقبال تمام دوستوں کے لئے تفریح طبع کا مناسب انتظام کر دیتا تھا۔ اس فراخ دلی پر سب اُس کے احسان مند رہتے تھے۔ اگر کسی اپنے ساتھی کو کسی ایرے غیرے سے بات کرتے دیکھتا تو اقبال کو جلن ہوتی تھی۔ ایسے دوست سے وہ خفا ہوتا۔

کچھ ہفتے گذر گئے یار دوستوں نے محسوس کیا کہ اقبال کا اُنیست و اپنائیت سے بھرا جذبہ آہستہ آہستہ مفقود ہوتا جا رہا ہے۔

اب وہ دوستوں کے لئے پریشان نہیں رہتا۔ جِن کی صحبت اپنانے کی خاطر اقبال سرگرداں رہتا تھا وُہی اب اُس کی جھلک پانے کے لئے بہت زیادہ بے چین رہنے لگے۔

اب اقبال خاموش اور کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ گھر سے بہت کم باہر آتا تھا اس بے توجہی اور بے اتفاقی کی وجہ جاننے کے لئے تمام دوست ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کرنے لگے۔۔۔۔آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ اقبال اس قدر بدل گئے ۔۔۔ کچھ احباب حالات سے تنگ آ کر اصلیت جاننے کی چاہ میں اقبال سے ملنے کا پروگرام ترتیب دے رہے تھے کہ اقبال کے یار غار امتیاز نمودار ہوئے اور اِس راز پر سے پردہ اُٹھا دیا کہ ''اقبال آج کل عشق فرما رہے ہیں''۔



بوجھ

وسیم اور اُس کی رفیقہ حیات رشیدہ ہنسی خوشی زندگی گذار رہے تھے۔ وسیم بینک میں منیجر تھے۔ اور اُن کی اِتنی معقول تنخواہ تھی کہ اخراجات پورے کرنے پر کچھ پس انداز بھی ہوتا۔ یکے بعد دیگرے اُن کے چار بیٹے ہوگئے رشیدہ بہت خوش تھی اولاد نرینہ پا کر۔ البتہ دونوں کو یہ دُکھ کھائے جارہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں لڑکی سے محروم رکھا ہے۔

وقت گذرتا گیا۔ بیٹے جوان ہوگئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی شادیاں بھی ہوگئی۔ بھرے پورے گھر میں چار بہوئیں بھی آگئیں۔ ہنسی خوشی زندگی گذارنے لگے۔

خوشی کے ساتھ غم کا آنا لازمی ہے اور یہ خوشی بھی زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکی۔

ایک دن وسیم دفتر سے گھر آرہے تھے کہ بڑے چوک میں ایک ہتھ گولہ پھٹ گیا ---- کچھ افراد موقع واردات پر ہی ہلاک ہوگئے اُن میں وسیم بھی شامل تھے۔

رشیدہ زندگی کے ساتھی کے بغیر مانو ٹوٹ ٹوٹ سی گئی۔ کچھ دن تک گھریلو معاملات ٹھیک چلتے رہے۔ آہستہ آہستہ مزاج میں یکسانیت نہ ہونے کے باعث بہوؤں میں جھگڑا ہونے لگا۔ جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ بھائیوں میں پہلے جیسا پیار نہ رہا۔ اور انہوں نے آپس میں منقولہ جائیداد کا بٹوارہ کرلیا۔ کل تک شوہر کی سرپرستی میں گھرانہ خوشحال تھا اُن کی موت کے بعد بکھر کے رہ گیا۔ زمین اور حویلی فروخت کر کے بھائیوں نے الگ بستیوں

میں اپنے لئے مکان تعمیر کرائے۔ پہلے سب بھائی ایک دوسرے کی دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے لیکن اب اپنا پن نہ رہا۔

رشیدہ بڑے لڑکے کے ساتھ رہی۔ کچھ دنوں حالات میں سکون رہا۔ ایک شام جبکہ رشیدہ دالان میں چاول چُن رہی تھی۔ بیٹے سے بہُو کو کہتے سُنا۔

''ہم نے کیا ماں کو اپنے گھر میں رکھنے کا ٹھیکہ لیا ہے۔

آپ ماں سے کچھ کہتے کیوں نہیں۔ اور بھی تین بیٹے ہیں!

اُن کی بھی کچھ ذمہ داری ہے''۔

باقی بھائیوں کو بُلایا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ ماں سال میں تین مہینے ہر بیٹے کے ہاں رہے گی۔ سب نے یہ فیصلہ منظور کرلیا۔

اب رشیدہ کا سال بٹ گیا۔ تین ماہ کی آخری تاریخ آتی تو رشیدہ اپنا مختصر سامان اُٹھا کر دوسرے بیٹے کے گھر جانے کی تیاری کرتی۔ رشیدہ کی زندگی بٹ کر رہ گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ ماں باپ درجن بھر بچوں کی دیکھ بھال کرتے تھکتے نہیں لیکن برسرروزگار بیٹوں کے لئے والدین بوجھ بن جاتے ہیں۔۔۔ یہ کیسا پیار ہے۔



رفیقِ حیات

افتخار MBBS کر کے مزید تعلیم کے لئے انگلستان جانا چاہتا تھا۔ والد شیخ ریاض الدین کی خواہش تھی کہ افتخار زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کر کے قابل ڈاکٹر بنے۔ البتہ ماں رفیقہ بیگم کا کہنا تھا کہ باہر جانے والے اکثر افراد کے خیالات بدلتے رہتے ہیں۔ وہ چاہتی تھی کہ انگلستان جانے سے قبل لختِ جگر کے سر پر سہرا بندھا دیکھے۔

الغرض افتخار کا نکاح اُس کے بچپن کی منگیتر شگفتہ سے ہوا اور یہ بھی طے پایا کہ رخصتی اُس کے لوٹنے کے بعد ہوگی۔ شگفتہ دراصل افتخار کی خالہ زاد بہن تھی۔ اُس نے انٹرنس پاس کرنے کے بعد گھر میں ہی دینی اور ادبی کتابوں اور جریدوں کا مطالعہ جاری رکھا۔ پانچ وقت کی نماز پابندی سے ادا کرتی اور پھر محلے بھر کے بچوں اور بچیوں کو دینی تعلیم سے روشناس کرانا اُس نے اپنا معمول بنالیا۔ گویا مذہبی ماحول سے وابستہ اطمینان کی زندگی گذارتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم پر اُس کا غیر متزلزل بھروسہ تھا۔ اُس نے قرآن و حدیث کے حوالے سے ایک کتابچہ ''رفیقِ حیات'' کے عنوان سے ترتیب دے کر چھپوایا جسے کافی سراہا گیا۔

اُس کے چھوٹے بھائی احمر نے بھی شگفتہ کا بھرپور ساتھ دیا۔ وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔

اِفتخار نے انگلستان میں اپنی ہم جماعت انگریز لڑکی ٹریسا سے کورٹ میں شادی رچائی۔ اصلیت کا علم گھر والوں کو ہوا تو شیخ ریاض الدین کٹی شاخ کی صورت زمین بوس ہو گئے اور وفورِ غم میں اِسی عالم میں دائمی نیند سو گئے۔ شگفتہ کو دِلی دُکھ ہوا۔ البتہ پریشان ہونے کے بجائے قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول ہو گئی۔

افتخار اعلیٰ ڈگری کے ساتھ ساتھ انگریز بیوی لیکر لوٹا اور ماں کو چھوڑ کر بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

شگفتہ افتخار کی ماں کا بھی خیال رکھنے لگی۔۔۔ کچھ بہاریں آئیں اور چلی گئیں۔

ایک روز بمبئی سے اپنے رشتہ کے بھائی شہزاد کا خط شگفتہ کو ملا۔

"دیدی افتخار کی طبیعت بہت ہی خراب چل رہی ہے۔ اُس کی حالت واقعی نازک ہے۔ خسرہ نکلی ہے۔ اُس کے سارے واقف کار حتیٰ کہ بیوی نے بھی ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ وہ انگلستان واپس چلی گئی ہے۔ ہسپتال میں بے سروسامانی کی حالت میں پڑا ہے۔ لگتا ہے اُسے تمہاری بددُعا لگی ہے۔"

خط پڑھتے ہی شگفتہ کی آنکھیں شدتِ غم سے بھر آئیں۔ اور پھر نمازِ عصر ادا کرنے کے بعد ایک نئے جذبے کے ساتھ اپنے آپ کو سنبھالا۔

"رحمٰن بابا ہوائی جہاز سے بمبئی کے لئے ٹکٹ بک کراؤ"

"بیٹی یہ تم کیا کہہ رہی ہو" یہ ساس تھی

"نہیں ماں! مجھے جانا ہے۔ میں اُن کی رفیقِ حیات

ہوں۔ مجھے نہ روکو، آج اُن کو میری ضرورت ہے۔"

اگلے روز شہزاد کی شرکت میں ہسپتال پہونچ گئی۔

افتخار ساکت بیڈ پر پڑا تھا۔ چہرہ چھالوں سے بھرا ہوا، چوڑیوں کی کھنک اور سسکیوں سے افتخار کی آنکھیں کُھل گئیں۔

افتخار کی آنکھوں میں ندامت کے نقوش اُبھر آئے۔ اُس کے ہونٹ ہلے

"آخر تم آ گئیں شگفتہ مجھے معاف کرنا۔ میں نے تم پر ظلم کے پہاڑ توڑ دئے۔ کاش میں مرجاتا......"

"ایسا مت کہے۔ آپ بہت جلد صحت یاب ہوں گے"

یہ کہتے ہی شگفتہ نے افتخار کا ہاتھ تھام لیا اور فرطِ محبت میں افتخار نے شگفتہ کے قدموں میں گر کے رونا شروع کیا۔

"افتخار ہمت سے کام لو۔ اِنشاء اللہ ہماری خوشیاں لوٹ آئینگی۔ فی الحال مجھے دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا کرنے کی مہلت دو" یہ کہہ کے شگفتہ باتھ روم میں وضو کرنے چلی گئی۔



جذباتی اندازِ فکر

رمضان بابا کا اکلوتا بیٹا نذیر منڈی سے سبزی خرید کے ریڑھی میں بستی بستی جا کے فروخت کرتا تھا۔ بوڑھے والدین کا واحد سہارا نذیر تھا۔ ایک دفعہ ریڑھی لیکر سبزی منڈی جا رہا تھا کہ بڑے بازار کے نکڑ پر تیز رفتار ٹرک نے ٹکر ماردی۔ نذیر بڑے پتھر سے جاٹکرایا بائیں کاندھے اور کنپٹی میں چوٹ آئی تھی۔ خون فوراً ہی کی صورت بہہ رہا تھا۔

ہسپتال میں ڈاکٹروں نے خون کا بندوبست کرنے کو کہا۔۔۔ رمضان بابا بے بسی کے عالم میں رہ چلتے ایک ایک فرد سے خون کی بھیک مانگتا رہا لیکن اُس کی فریاد صدا بہ صحرا ثابت ہوگئی۔۔۔ اور نذیر بوڑھے باپ کی گود میں دم توڑ بیٹھا۔

شام کو بیٹے کو دفنانے کے بعد رمضان بابا واپس گھر آرہا تھا کہ نیلم چوک میں کھل بلی مچی تھی۔ آنِ واحد میں جمع بھیڑ پر لاٹھیاں اور گولیاں برسائیں گئیں دیکھتے ہی دیکھتے سارا چوک خون میں سیراب ہو گیا۔

افسوس اِنسانی جان بچانے کے لئے کسی نے خون کا ایک قطرہ نہ دیا اور سیاسی و جذباتی ڈگر سے وابستہ شاہراہ کو اسی خون سے رنگین کیا گیا۔۔۔



ہڑتال

معمولی سے معمولی بات پر ہڑتال کا بگل بجایا جانے لگا ہے۔اور لگتا ہے کہ اب اس بے مطلب احتجاجی حربے کے لوگ عادی ہو چکے ہیں جب ہی اس کے خلاف کسی بھی طرح کی آواز بلند نہیں کی جاتی۔۔۔۔پہلے تو خاص وجوہات کے باعث سال میں ایک دو بار ہڑتال کی کال دی جاتی تھی۔ زیادہ تر سرکاری ملازمین یا کارخانوں میں کام کرنے والے اراکین یا پھر دیگر محنت کش طبقے ہی اپنی جائز مانگیں پوری نہ ہونے کی صورت میں ہڑتال کیا کرتے تھے۔

گذشتہ تحریکی برسوں میں علیحدگی پسند ذمہ داران کی مہربانیوں کے باعث لگ بھگ سال بھر کا طویل عرصہ ہڑتالوں کی نذر ہوا۔ کسی تحریکی رُکن کو نامعلوم بندوق برداروں نے موت کی نیند سُلایا تو ہڑتال، کسی بھی زعیم کو ناگہانی حوادث کا سامنا کرنا پڑا تو ہڑتال اور کوئی تحریکی دلدادہ کسی واردات میں زخمی ہوا تو ہڑتال۔

حالانکہ اس حقیقت کا ہر ایک کو اعتراف کہ ہڑتالی سیاست چلانے سے فقط مفلس، لاچار، محنت کش مزدور اور یومیہ اُجرت پانے والے چھوٹے ملازمین ہی اعتاب وزیاں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ایک سچے واقعے کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں تا کہ تحریک و دیگر ذمہ داروں کو ہڑتال کے اثرات کا کچھ تو احساس ہو۔

ہوا یوں کہ علحیدگی پسند گروہ کے ایک زعیم کے کہنے پر وادی بھر میں تین دن کی ہڑتال کی گئی۔ ہڑتال کُھلنے پر چوتھے روز گھر سے چلا تو بائی پاس چوک میں لوگوں کی بھیڑ جمع تھی۔ ایک ریڈی والا دو چھوٹے بچوں کی شرکت میں زار و قطار رو رہا تھا۔ سامنے سڑے ہوئے انگور کے تین ڈبے پڑے تھے۔

دراصل ہڑتال سے قبل ہی سویرے میوہ فروش گلزار نے میوہ منڈی سے تین پکے انگور کے ڈبے خرید لئے تھے۔ ہڑتال کی وجہ سے وہ فروخت نہیں کر سکا۔ اور انگور گرمی کی وجہ سے سڑ گئے۔ اب وہ بچوں کو کیا کھلائے اس پر ماتم کناں تھا۔

وہاں جمع شدہ افراد نے کچھ نقدی جمع کر کے گلزار کے ہاتھ میں تھما دی اور دِلاسا دیا۔

میں سوچتا رہ گیا کہ ہڑتال کرانے سے گورنمنٹ یا سیکورٹی فورسز کو کون سا نقصان اُٹھانا پڑتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہڑتال کی وجہ سے ایک غریب ویومیہ اُجرت پانے والے افراد پر قیامت ٹوٹتی ہے۔



متضاد سوچ

کمیل والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اُس کی پرورش بہت ہی خوش گوار ماحول میں ہوئی۔ بچپن اور لڑکپن میں جس چیز کی اُسے طلب رہی بلا کسی دِقت کے دستیاب رہی۔

کمیل نے زیادہ نہیں پڑھا بلکہ اِنٹرس پاس کرنے کے بعد ہی اپنے والد کا لمبا چوڑا کاروبار سنبھال لیا۔ شادی ایک متمول گھرانے کی قبولِ صورت لڑکی سے ہوئی۔ کمیل اور راحیلہ ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہنے لگے۔ وقت گذرتا گیا۔ والدین پوتا یا پوتی کے لئے بے چینی کے ساتھ انتظار کرتے رہے۔ لیکن اُن کی تمنا پوری نہ ہوسکی۔ اِسی حالت میں بیس برس کا طویل عرصہ گذر گیا۔

اولاد کے لئے والدین نے دوسری شادی پر زور دیا۔ لیکن کمیل نے صاف انکار کردیا۔ وہ اپنے اور راحیلہ کے درمیان کسی دوسری ہستی کے وجود کی بابت سوچنا بھی گناہ تصور کرتا تھا۔

الغرض خاندانی وارث کی بابت کمیل کو سمجھایا گیا۔ اور پھر حالات کے زیرِ اثر راحیلہ نے ہی کمیل کو دوسری شادی کے لئے آمادہ کردیا۔

عالیہ سوت بن کر گھر کو آباد کرگئی۔

راحیلہ اور عالیہ ایک دوسرے سے والہانہ پیار جتانے لگیں جیسے وہ دو بہنیں

ہوں۔

خدا کا کرنا پھر بھی اولاد کی نعمت سے گھرانہ محروم رہا۔ وقت گذرتا گیا۔ والدین یکے بعد دیگرے دائمی نیند سو گئے۔ اِدھر عمر رسیدہ راحیلہ اور جوان عالیہ کی سوچ میں تبدیلی سمانے لگیں اور وہ اندازِ دیگر میں سوچنے لگیں۔ عالیہ چاہتی تھی کہ اُس کا خاوند جوان نظر آئے تو موقع پاکر وہ کمیل کے سر کے سفید بال توڑتی رہی۔ اُدھر سے راحیلہ چاہتی تھی کہ کمیل اُس کی طرح بوڑھا نظر آئے۔ اس غرض سے وہ موقع پاکر کمیل کے سر کے سیاہ بال نوچتی رہی۔

راحیلہ اور عالیہ کی مُتضاد سوچ و فِکر کے زیرِ اثر تھوڑے ہی عرصے میں کمیل کے سر کی کھیتی چٹیل میدان کا روپ دھار گئی۔

بوڑھی راحیلہ اور جوان عالیہ کے مابین کمیل کی حالت ایک جراب سے کم نہ تھی۔ اوپر پاؤں نیچے بوٹ اور درمیان میں موزہ کی حالت ناگفتہ بہہ۔



اپنا پرایا

فیاض پیشہ سے سول انجنیئر ہے۔ والدین کا اکلوتا بیٹا ہونے اور ماں کے بے جا لاڈو پیار کے باعث وہ لڑکپن سے ہی لا اُبالی پن اور سرکش طبیعتی کا دِلدادہ بنا رہا۔ اس قدر ضدی کہ جس چیز کی طلب رہی وہ کسی بھی صورت میں حاصل ہو۔ ورنہ چِلا چِلا کے آسمان سر پر اُٹھائے۔

جان پہچان والوں نے صلاح دی کہ ازدواجی زیست کی لذت سے مستفید ہونے کے بعد فیاض کے مزاج میں تبدیلی سما جائے گی اور اُسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوگا۔ والدین نے اپنے رشتے کی لڑکی ذاکرہ کا انتخاب بطور بہو کر لیا۔ لیکن فیاض نے خلاف امید عین وقت پر والدین کی چاہت کو خاطر میں نہ لائے بتول نامی قبولِ صورت اور خُود سر لڑکی کو عدالت کی وساطت شریک زیست کا درجہ بخشا۔

ڈیوٹی گھر سے دُور پہاڑی علاقے میں تھی۔ اور کچھ برس کے بعد ٹرانسفر ہو کے فیاض گھر واپس آ گئے تو عالیہ کے نام سے ایک ننھی گڈیا بھی ساتھ میں تھی۔ اب تو عالیہ تیسری جماعت میں پڑھتی ہے۔ نہایت ہی حساس اور ذہین لڑکی ہے۔ بلا کی زیرکی پائی ہے۔ اِس نوعمری میں بھی دادا کے ذہن میں اُبھرنے والی کہانی کے چند نکات بغور سُن لیتی ہے اور معصومانہ انداز میں کہانی کو نیا موڑ دینے کی نیت سے تجاویز پیش کرتی ہے۔ دادا نے

عالیہ کے مشوروں کو اکثر برمحل جان کے اپنایا ہے۔

بتول کا ہاتھ بٹانے اور گھر باغیچے میں کام کرنے کی غرض سے ایک بارہ سالہ پہاڑی لڑکے عمران کو فیاض نے گھر لایا۔ عمران بہت ہی ہوشیار، پُھرتیلا اور حاضر جواب تھا۔ کچھ ہی دنوں میں اُس نے سارا کام سنبھالا۔ اور ہر ایک کے دل میں اپنے لئے جگہ بنانے میں کامیاب اُترا۔

اب سب ہی اُسے نام کے بجائے ''بیٹا'' کہہ کے یاد کرنے لگے۔۔۔۔ عمران کا گھر میں آنے اور اُسے ''بیٹا'' کے نام سے پکارنے سے عالیہ کے مزاج میں تبدیلی سمانے لگی۔ یہ جانے کیوں اُس کی نظروں میں عمران کھٹکنے لگا۔ کوئی نہ کوئی شکایت لیکر دادا کے پاس جاتی۔

''دادو یہ عمران بڑا کام چور ہے۔ دن بھر میری
چیزوں سے کھیلتا رہتا ہے۔ اُسے تمیز نہیں''

''عالیہ بیٹا! عمران بھی تو چھوٹا ہی ہے۔ وہ بھی کسی کا لاڈلا بیٹا ہے۔ غریب ہونے کے باعث ہمارے یہاں کام کرنے پر مجبور ہے۔ اُس سے نفرت جتانا اچھا نہیں''۔ دادا نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''پر دادو! سب نے بیٹا بیٹا کہہ کے اُسے سر پر چڑھایا
ہے۔۔۔ دادو اپنا اپنا ہی ہوتا ہے۔ پرایا کبھی بھی اپنا نہیں
بن سکتا۔''

عالیہ کی وزن دار باتوں نے دادا کو لاجواب کردیا۔ گو عالیہ کو سب نے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن لحظہ بہ لحظہ اُس کے مزاج میں چڑچڑا پن سمانے لگا۔ اُسے ایسا لگا کہ

مما پاپا اور دادا دادی کا پیار جو صرف اُس کے لئے وقف ہے عمران کے آنے سے بٹ کے رہ گیا ہے۔

عالیہ کے کرخت پن اور تُرش روی میں اضافہ ہونے لگا اور اُس کی صحت بھی گرنے لگی۔۔۔۔ اب تو اسکول کا کام کرنے اور مکتب جانے سے بھی جی چُرانے لگی۔ بتول کو اور فِکر لاحق ہوئی جب کلاس ٹیچر نے جِتا دیا کہ" عالیہ اب پڑھائی میں کم دل چسپی لینے لگی ہے۔ اور زیادہ تر چُپ چاپ سوچا کرتی ہے۔ کچھ بتاتی بھی نہیں" دادا نے عالیہ کا ذکر فیملی ڈاکٹر الطاف سے کر دیا تو اُس نے صاف صاف کہہ دیا کہ نفسیاتی مرض کا ہدف بنے عالیہ کے ذہن میں یہ بات گھر کر گئی ہے کہ عمران اُس کی پیار بھری نگری میں نفرت اور بدگمانی سے لبریز حالات رونما کرنا چاہتا ہے۔

الغرض ڈاکٹر کے مشورہ کے تحت عمران کو واپس اُس کے گھر روانہ کیا گیا۔ اور بدلے میں پاس والے گاؤں کی عمر رسیدہ خاتون کو گھریلو کام کے لئے رکھا گیا۔ آہستہ آہستہ عالیہ کے مزاج میں متوازن و خوشگوار تبدیلی دیکھنے کو ملی۔ اُس کی تُرش روی اور ضدی پن بدلنے لگا۔ اب وہ بالکل نارمل لگ رہی ہے اور دل جمعی کے ساتھ درسی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے کاموں میں مما کا ہاتھ بٹاتی ہے اور پہلے ہی کی طرح دادا کی کہانیوں میں نیا موڑ دینے کی بابت اپنے ننھے مُنے خیالات کا اظہار کرنے میں پیش پیش رہتی ہے۔



کوتاہ اندیش

دفتر سے گھر واپس آرہا تھا کہ بائی پاس چوک کے نکڑ پر ایک شخص کو بارہ سالہ بچے کو پیٹتے دیکھا۔ لڑکا زار و قطار رو رہا تھا۔ سامنے جا کے اصلیت جاننے کی کوشش کی۔

''بچے کو کیوں مارتے ہو''

''یہ نالایق میرا بیٹا ہے۔ ابھی سے نشیلی سگریٹ پینے لگا ہے۔ آج میں نے اِس کم بخت کو سگریٹ پیتے پکڑ لیا''

''لیکن یہ عادت اُسے کیسے پڑ گئی اور یہ سگریٹ اُسے ملی کہاں سے۔ یہ تو پوچھنا تھا''۔

میری رگ تجسس جاگ اُٹھی،

''سُنا ہے کہ اسکول کے باہر کوئی آدمی یہ نشیلی چیزیں فروخت کرتا ہے''

''بہتر رہتا کہ اُس شخص کو پولیس کے حوالے کیا جاتا اور ہاں رقم اِسے کہاں سے ملتی ہے''، میں نے لقمہ دیا۔

''دیتی ہوگی ماں! اُس کے لاڈ نے بگاڑ کے رکھا ہے''

اتنا کہہ کے وہ بچے پر پھر ہاتھ اُٹھانے لگا تو میں نے سختی سے سمجھانے کی سعی کی۔

''دیکھئے لڑکے کو مارنے سے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔

پیار و محبت کے ساتھ اِسے بتا دیجئے کہ اِس فعل میں کتنے
مُضر اثرات پنہاں ہیں۔ اور اِسے گھر میں صاف ستھرا
ماحول فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش کیجئے۔''

یہ سُننا تھا کہ متذکرہ شخص لڑکے کو اسکوٹر کے پیچھے بٹھائے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اگلے روز روزنامہ ''آفتاب'' میں یہ خبر بھی پڑھنے کو ملی کہ پولیس نے رات دیر گئے ''دِلدار ہوٹل'' میں چھاپہ مار کے منشیات کا دھندہ کرنے والے تین افراد کو حراست میں لیا ہے۔ خبر کے ساتھ جو فوٹو چھپی تھی اُس میں ایک اُس شخص کی تھی جو اپنے بیٹے کو سرِ راہ پیٹ رہا تھا۔

واہ رے حضرتِ انسان کی یہ کوتاہ اندیشی!۔



گھناونی تصویر

عقیلہ بیوگی کا لباس زیب تن کئے کچھ دنوں سے بیمار پڑی ہے۔ پاس ہی سات سالہ ناصر غم گین ور نجیدہ صورت بیٹھا ہے۔ شریک حیات کی موت کے بعد عقیلہ پاس میں مولوی صاحب اور خان صاحب کے گھر میں صفائی کرنے کے عوض کچھ نقدی پائے بچے کو پالتی تھی۔

''بیٹا یہ لو تمہارے ابو کے پرانے اخبارات و جرائد
اِسے ردی میں فروخت کر کے کچھ کھانے کے لئے لے
آؤ''

ردی کا بنڈل کریانہ فروش کی جانب بڑھا دیا۔

کریانہ فروش نے ردی کا بنڈل لئے ناصر کی جانب اندازِ دگر میں گھورا اور بڑ بڑایا۔

''ابھی بکری ہوئی نہیں اور یہ لونڈا آ گیا اپنا چک کیش کرانے''

ناصر نے عاجزی سے کہا

''ماں کچھ دِنوں سے بیمار ہے کچھ کھانے کو نہیں آپ
چار آنہ کلو قیمت کم ہی دو مگر بنڈل رکھ دو''۔

کریانہ فروش ردی کا پلندہ تولنے لگا کہ اتنے میں اسکوٹر پر سوار ایک پندرہ سالہ خوش باش لڑکے نے چلا کر کہا۔

''کاکا مجھے جلدی ہے ۔ جلدی سے گولڈ فلیک
پاکٹ، امول چاکلیٹ اور ہائیڈ اینڈ سیک بسکٹ دیدو۔''

اس کے ساتھ ہی ایک سو کا نوٹ دکاندار کو تھما دیا اور خود سگریٹ سُلگائے دھویں کے مرغولے اُڑانے لگا۔ لڑکے کے جانے کے بعد کریانہ فروش نے کچھ ریز گاری ناصر کو ردی کے بدلے میں دی۔

ناصر نے ڈبل روٹی اور دودھ کا پاکٹ خرید کے گھر کا رُخ کیا۔ وہ مرے مرے قدموں کے ساتھ سوچ رہا تھا کہ یہ تفریق کی کتنی گھناونی تصویر ہے کہ ایک گھر میں کھانے کو اناج کا دانہ تک نہیں اور دوسرے گھر میں دولت کی اتنی فراوانی کہ کم سن بچے تک دادِ عیش لے رہے ہیں۔



عتاب زدہ

دن کے نو بجنے کو تھے۔ راستوں پر بھیڑ بڑھنے لگی تھی۔ دسمبر کے آغاز کی سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ سارا ماحول ٹھٹھرا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ راشد اندازِ بے نیازی سے اپنے لانبے ڈھیلے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور کانوں و گردن سے ایک بوسیدہ مفلر لپیٹے تیز رفتاری کے ساتھ سڑک کے کنارے جا رہا تھا۔ جیسے موسم کی سختی کو اُس نے اپنی زندگی سے ہم آہنگ کر دیا ہو۔

راشد فرنیچر بنانے کے کارخانے میں یومیہ اُجرت پر کام کرتا تھا۔ کارخانہ صبح آٹھ بجے کھلتا اور شام پانچ بجے تک کام چلتا رہتا۔ یہ سلسلہ سال بھر یکساں رہتا تھا۔

آج پھر راشد کو دیر ہوگئی تھی۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ حالات سے مجبور تھا۔ ماں مہینوں سے بسترِ مرض پر دراز اور اتنا سرمایہ دستیاب نہیں کہ اُس کا ڈھنگ سے علاج ہو سکے۔ رات سے طبیعت زیادہ خراب چل رہی تھی۔ ڈاکٹر اِشفاق نے مُلاحظہ کرنے پر کچھ دوائیاں لکھ دیں اور ساتھ میں ہسپتال لے جانے کی صلاح بھی دی۔ ماں کے علاوہ چھوٹی بہن ناظمہ جو ماں کی تیمارداری کے علاوہ گھر کا کام کاج سنبھالتی ہے۔

ساٹھ روپئے راشد کو یومیہ اُجرت مقرر تھی۔ جس میں کھانے پینے کے اخراجات بہ مشکل پورے ہو پاتے تھے۔ صبح ناشتہ سے فارغ ہوئے ناظمہ نے معصومیت سے کہا تھا

''بھیا! راشن ختم ہونے کو آیا ہے۔ واپسی پر ماں کی دوائی اور ڈبل روٹی ضرور لے آنا''۔

راشد سوا گھنٹہ دیر سے کارخانہ پہنچا اور جلدی سے کوٹ اُتار کر کام میں جھٹ گیا معاً کرخت آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''راشد تمہاری ڈیوٹی کا کیا ٹائم ہے؟''

راشد نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ ولیم سیکشن انچارج اُسے شعلہ بار نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

''جی آٹھ سے پانچ تک۔'' راشد نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

'' اس وقت سوا نو بج رہے ہیں۔ تمہیں سوا گھنٹہ مزید کام کرنا پڑے گا ورنہ مزدوری کم ملے گی۔''

''حضور میری ماں زیادہ بیمار تھی۔۔ اُسے ڈاکٹر کو دِکھانا تھا'' انچارج سیکشن جا چکا تھا۔ اور راشد کی آواز کارخانے میں نصب مشینوں کے شور میں دب کر رہ گئی۔

اتنے میں اُس کے بازو والا مشین مین کرتار اُسے مخاطب ہوا

''ولیم بابو کے کانوں میں راشد بھیا فقط مشینوں کی آواز ہی پہونچ سکتی ہے۔ ہمارے زخمی دلوں کی آہ اُس کی سماعت کی بلندیوں کو نہ پا سکے گی۔ ظلم اور بے انصافی کے اندھیرے تو ہمیں ورثے میں ملے ہیں۔ حالیہ ترقی یافتہ دور میں بھی ہماری خوش حالی کی راہیں مسدوُد ہیں۔۔۔ لیکن وہ دن دُور نہیں جب واہِ گُرو کی مہربانی سے بہتری و بہبودی کی شاہراہیں ہمارے لئے کُھل جائیں گی۔۔۔ آج سوا گھنٹہ لیٹ سہی۔ ہمت سے کام لو۔''

راشد سر جُھکائے ساتھی کی باتیں سُنتا رہا۔ اور نگاہیں اُٹھائے بولا

''کیا بتاؤں کرتار میرے ساتھ کتنی پریشانیاں ہیں۔ آج ماں کی حالت نہایت ہی ابتر لگی۔ اُس کی دوائی۔۔۔

''میں سب کچھ سمجھتا ہوں راشد'' کرتار نے بات کاٹے اپنائیت بھرا لہجہ اپنایا۔

''مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو میں خوش ہوں ارے باپو ہسپتال میں پڑا ہے۔ بیٹے کلونٹ کو اسکول میں داخل نہیں کر پاتا ۔۔۔ ہماری طرح نہ جانے کتنے لوگ طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔۔۔ تم نے کچھ لوگوں کو فُٹ باتھ پر دیسی شراب کے جام چڑھا کر قہقہے لگاتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ لیکن اُن کے دل بھی یاسیت سے لبریز ہوتے ہیں۔ اُن کی روح کی سِسکاریوں کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اسی طرح تمہیں کچھ خستہ دِل ساتھی بازارِ حُسن کی روشن گلیوں میں چکر لگاتے نظر آئینگے لیکن ذرا اُن کے گھروں پر نظر ڈالو وہاں تمہیں تاریکیوں اور آہوں کے سوا کچھ نہ ملے گا۔۔۔ کیا کریں لگتا ہے یہ اِس جہاں کا دستور ہے۔ اب دیکھو نا ہم جی توڑ محنت کرتے ہیں اور کارخانے کا سیٹھ عیش کر رہا ہے۔ ہم چیزیں تیار کرتے ہیں اور مالک کی تجوریاں بھر جاتی ہیں۔ گو کارخانے ہمارے دم سے ہیں اور زندگی کی مسرتیں ہم سے دُور ہیں۔۔۔ راشد: دراصل ہم غریب لوگ مصیبتیں جھیلنے اور مایوسیوں کو گلے لگانے کے لیئے ہی اِس دنیا میں آئے ہیں۔ دِل چھوٹا نہ کر کے میں اپنے تمام حالات واہ گرو پر چھوڑ دیتا ہوں۔ ہم جگ کے داتا کے آگے بے بس ٹھہرے۔''

اتنا کہہ کر کرتار خاموش ہو گیا۔ راشد نے غایرانہ نظر اُس پر ڈالی اور کام میں جُھٹ گیا۔

کارخانے میں چھٹی کرنے کی گھنٹی بجی۔ بہت سے ساتھی کام ختم کر کے کارخانے سے نکلنے لگے البتہ کچھ لوگ بدستور مشینوں سے اُلجھے ہوئے تھے۔ یہ وہ مزدور تھے جو راشد کی طرح دیر سے کام پر آئے تھے۔ گویا اپنا وقت پورا کر رہے تھے۔

''ساڑھے چھ بج گئے راشد'' یہ عبدل کی آواز تھی۔

راشد نے مشین کا سوئچ آف کر دیا۔ اور سامنے کھڑکی سے باہر جھانکنے گا۔۔۔ دُور دُور تک ساری بستی پر دُھندسی چھانے لگی تھی۔ ماں کا خیال اُسے ستانے لگا۔ ٹائم کیپر سے دن بھر کی مزدوری کی رقم حاصل کئے وہ کارخانے کے احاطے سے باہر آیا۔ کرتار اُس کے انتظار میں تھا۔

''تم ابھی گھر نہیں گئے کرتار''

''سوچا آج تمہاری ماں کی خیریت دریافت کروں۔''

''تم کِس قدر عظیم انسان ہو کرتار''۔ راشد کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔

''کون ہوتے ہو تم میرے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ خلوص و اپنایت کسی ایک کی جاگیر نہیں۔ اور اِس طرح کے مروت بھرے جذبات غریبوں کے دِلوں میں ہی پلتے ہیں۔ میں تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں۔''

''ارے کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو راشد۔ محبت و دوستی کی بے لوثی کسی شکریہ کی محتاج نہیں ہوتی۔ دراصل خلوص و ہمدردی پر پست طبقہ کے ہر فرد کا پیدائشی حق ہے''۔

الغرض بازار سے کچھ سودا اور میڈکل اسٹور سے ماں کی دوائی خرید کے تیز قدموں کے ساتھ دونوں گھر کی جانب دوڑ پڑے۔ بہن ناظمہ کو گھر کے احاطے میں منتظر پایا۔

"بھیا آج زیادہ ہی دیر کردی۔، ماں کو نیند لگی ہے"

راشد نے تھیلہ ناظمہ کو تھما دیا اور کرتار کے ہمراہ ماں کو دوائی پلانے کی غرض سے کمرے میں گھسا۔ کمرے میں چراغ کی روشنی جیسے کانپ رہی تھی۔ بے تابی کے ساتھ راشد نے ماں کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ لیکن پیشانی برف کی مانند سرد تھی۔ پھر بوکھلا کر راشد نے ماں کا تمام جسم ٹٹول ڈالا۔ لیکن وہاں کیا تھا بے رُوح جسم البتہ ہونٹوں پر اُبھری مُسکراہٹ جسے زندگی میں لاکھوں آرزوؤں کے بعد بھی وہ حاصل نہ کرسکی تھی۔

کرتار نے بڑھ کر راشد کو سہارا دیا۔



واپسی

زرینہ جنسی خیانت کرنے پر مجبور ہوگئی۔ دراصل اُس کا شوہر عاصف ایک مصروف عہدہ پر فائز تھے۔ سگریٹ نوشی کے علاوہ شراب پینے کا عادی۔ سرکاری ذمہ داری نبھانے کے بعد گھر آنے کے بجائے اکثر کلب کا رُخ کر لیتے جہاں ہم خیال احباب کی صحبت میں باون پتوں کی اٹھک بیٹھک کے ساتھ ساتھ شراب کے دور چلتے اور رات کا خاصہ حصہ یونہی گذر جاتا۔

گھر واپس آنے پر خادم کو اپنا منتظر پاتا اور بسا اوقات کپڑے تبدیل کئے بغیر ہی پلنگ پر دراز ہو جاتے جہاں زرینہ کے خراٹوں سے اُس کا سواگت ہوتا۔ گویا عاصف اپنے حال میں مست شریک حیات کی جنسی ضروریات پورا کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ زرینہ کو جنسی راحت وسکون حاصل کرنے کی خاطر اندازِ دگر میں سوچنا پڑا۔ ویسے زرینہ عمر میں بھی عاصف سے قریباً دس برس چھوٹی تھی۔

کچھ مدت اِسی حالت میں گذرنے پر زرینہ کا ضمیر اِس خیانت و بے وفائی پر اُسے ملامت کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ احساسِ گناہ بڑھتا گیا اور زرینہ کا ذہنی سکون درہم برہم ہونے لگا۔ وہ اپنے وجود کو حقیر سمجھنے لگی۔ زرینہ کا یہ احساس اِس قدر بڑھا کہ اپنی اکلوتی بچی شیرین کو بھی پیار کرنے سے ہچکچانے لگی۔ کبھی اِس خیال سے کہ ’’کل کو وہ بھی اِس فعل بد میں ملوث نہ ہو جائے‘‘ زرینہ تڑپ کے رہ جاتی۔ وہ آرام سے سو سکتی نہ ہی اطمینان کے ساتھ گھریلو اُمورات بجالاتی۔

افراتفری کے عالم میں غلطاں اُس نے آخر کار عہد کرلیا کہ وہ اپنائی جانے والی

فاش غلطی سے باز آئے گی۔ شب جمعہ مقامی خانقاہ میں حاضری دیئے اُس نے عہد کرلیا کہ وہ بدیانتی کی ڈگر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناطہ توڑ دے گی۔ چاہے بدلے میں اُسے کتنی ہی کوفت سہنی پڑے۔

کچھ مدت پاک وصاف حالت میں گزارنے کے بعد بھی زرینہ کا ضمیر اُسے برابر کوستا رہا۔ آخر کار اُس نے طے کرلیا کہ وہ اپنائی گئی بے وفائی کی داستان اپنے شوہر کے گوش گذار کرکے دِل کا بوجھ ہلکا کرلے گی۔ ذہنی کوفت سے نجات پانے کی نیت سے وہ شریک حیات کے سامنے اعتراف گناہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ہمت نہیں ہوتی تھی۔۔۔ وہ خوفزدہ تھی۔۔۔ کبھی یہ ڈر کہ عاصف اصلیت جان کر اُسے جان سے مار ڈالے گا۔ کبھی یہ خدشہ کہ طلاق دے گا۔ ایسا ہوا تو شیرین سے بھی الگ ہونا پڑے گا۔ اس سب کے لئے زرینہ ہرگز ہرگز تیار نہ تھی۔

ایک روز طبیعت ناساز ہونے کے باعث عاصف جلدی گھر آگئے۔ زرینہ موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے عاصف کے سرہانے بیٹھ گی۔ ہمت خوف پر غالب آگئی۔ عاصف کا سر دباتے ہوئے زرینہ نے نہایت ہی مُخلصانہ انداز میں اپنے جُرم کا اعتراف کیا۔

عاصف سب کچھ سُن کے خاموش رہا۔ اور پھر خلافِ توقع ہفتوں یہ خاموشی کا سلسلہ طاری رہا۔ اس جانکاہ وطویل خاموشی نے زرینہ کو حیرت میں ڈال دیا۔ طرح طرح کے وسوسے اور خیالات اُس کے ذہن میں اُبھرنے لگے۔ وہ بُجھے بُجھے دل کے ساتھ واجبات ادا کرتی رہی۔ زرینہ کی حالت ابتر، بے چینی اور کرب نے اُسے بُری طرح سے ستانا شروع کردیا۔

اچانک ایک روز دفتر جاتے ہوئے قُفلِ سکوت توڑتے ہوئے عاصف نے

زرینہ کو اپنے پاس بُلایا اور برملا کہہ دیا۔

"فعل بد کے لئے میں نے تمہیں معاف کردیا۔"

زرینہ کے تن من میں بشاشت کی کرن پھوٹ پڑی۔ کردگار کا شکر بجالائے اُس نے نمازِ شکرانہ بھی ادا کردی۔ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بیت گئے۔ لیکن عاصف کے معمولات میں کسی طرح کا بدلاؤ دیکھنے کو نہیں ملا۔ گویا یہ خوشی زرینہ کے لئے عارضی ثابت ہوئی۔ اُسے یقین تھا کہ جُرم کا اعتراف کرنے کے بعد عاصف اور اُس کے مابین فاصلہ کٹ جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اب زرینہ کے دِل میں خوشی کے بجائے ایک عجیب قسم کی حقارت کا احساس اُبھرنے لگا۔ البتہ اِس بار اپنے کو نہیں بلکہ عاصف کو حقیر سمجھنے لگی۔

زرینہ طرح طرح کے سوچوں میں گُم۔ لگتا ہے کہ اعترافِ گناہ پر شوہر نے دل کے بجائے زبان سے ہی معاف کردیا ہے۔۔۔ کسی طرح کی ناراضگی کا اظہار تک نہیں کیا۔۔۔ مجھ پر ہاتھ بھی نہیں اُٹھایا اور نہ ہی طلاق دینے کی دھمکی دی۔

لحظہ بہ لحظہ عاصفَ کے لئے حقارت ونفرت زرینہ کے دل میں بڑھنے لگی۔ اُس نے اپنے وجود کو بے چینی و بے قراری کے بحرِ بے کراں میں غوطہ زن پایا۔

بہت سوچنے اور غور کرنے کے بعد زرینہ کے لئے ضروری بن گیا کہ وہ ایک ایسا حل تلاش کرلے تاکہ وہ اِس شدید کرب و بے قراری سے چھُٹکارا پا سکے۔

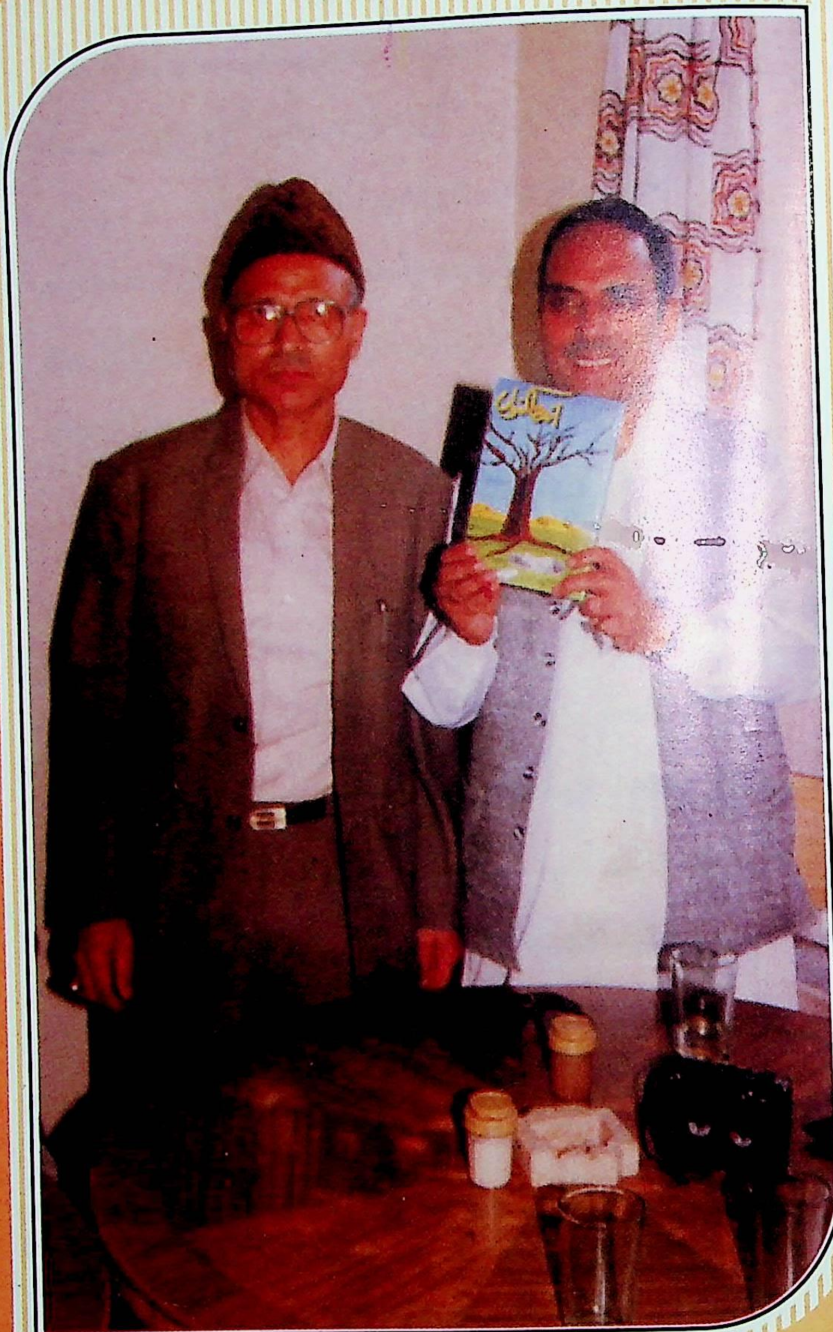
الغرض زرینہ نے خوب سوچا!

آخر کار دِل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُس نے وہ حل نکالا۔

وہ پھر سے جنسی بے راہ روی کی راہ پر لوٹ آئی۔



ہمارے بھی ہیں مہرباں.........



مرحوم حکیم منظور اور حسن ساہو (اندھا کنواں کے رسم رونمائی پر)

مولانا حسن عباس فطرت (پونے)

حسن ساہو کے افسانے اور مضامین برسوں سے پڑھتا آیا ہوں۔ وہ ایک کہنہ مشق، ممتاز اور جاندار قلم کار ہیں جس نے ادبیات اور صحافت میں نام پیدا کیا ہے۔

آس پاس کے واقعات و حادثات سے متاثر ہو کر اُن کو افسانوی روپ دینے میں اُن کو زبردست مہارت حاصل ہے

حسن ساہو کے اکثر مختصر افسانے وطن اور سماج کے احساسات کو بیدار کرنے میں کامیاب نظر آرہے ہیں۔

خدا کرے زور قلم اور زیادہ



(مکتوب ۱۶، اکتوبر ۱۹۸۵ء)

☆☆☆

مظہر امام (دہلی)

آپ کے افسانے باقاعدگی سے رسائل میں دیکھتا رہا ہوں۔ میں نے ماہنامہ ''تعمیر'' میں شائع شدہ آپ کے افسانوں کی اُن دِنوں تعریف کی تھی۔۔ آپ کے کئی افسانے پسند آئے۔ آپ کا فن روبہ ارتقا ہے اور آپ کے ہاں تھکن کے آثار نہیں ہیں۔



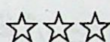
(مکتوب ۱۵، اگست ۲۰۰۱ء)

☆☆☆

آنجہانی آنند بخشی (بمبئی)

آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ آپ کے افسانوں میں سچائی ہے اور اِنسانیت کی رمق آپ کا افسانہ ''مندر سے مسجد تک'' دِل کو چھو گیا!

(مکتوب ۲۶، اپریل ۱۹۹۸ء)



پروفیسر فضل امام رضوی (لکھنو)

''اندھا کنواں''، تخلیقی فن کا عمدہ اور بہتر نمونہ ہے۔

حسن ساہو نے اپنے قلم کی جولانیوں سے موضوع کو کامرانیوں تک پہنچایا ہے۔ وہ ایک مشاق قلم کار ہے۔ افسانوی ادب کے رموز و نکات سے بخوبی واقف ہیں۔ اس ادب پارے میں بھی اُنہوں نے فکری و فنی توانائیوں کے جلوۂ صدرنگ پیش کئے ہیں۔ اِس کامیاب و نتیجہ خیز کاوش پر میں اُنہیں ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

(مکتوب ۶، اگست ۲۰۰۲ء)



ہمدم کاشمیری (سرینگر)

حسن ساہو کا اسلوب اور اپروچ روایتی ہے۔ اُن کے افسانوں میں کہانی پن اور جزئیات نگاری دیکھی جاسکتی ہے
اُن کے موضوعات سامنے کے کردار جانے پہچانے اور زندگی کے قریب ہوتے ہیں۔

(مکتوب ۳۱ مئی ۲۰۰۴ء،)



ڈاکٹر اکبر حیدری (سرینگر)

ساہو صاحب ہرفن مولا ہیں۔ وہ ایک خاموش ادیب، سماجی کارکن اور ایک اچھے مُقرر ہیں۔ باصلاحیت اور ممتاز افسانہ نگار بھی ہیں۔۔۔۔۔ کچھ افسانے پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مختصر افسانہ نگاری میں ساہو صاحب ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اُن کے مکالمے اور کردار ہم جیسے ہیں یعنی ہمارے معاشرے کے افراد، ہر افسانے کا پلاٹ مربوط ہے اور فنی زبان شیرین اسلوب بیان دلکش اور دل آویز۔

(مکتوب ۱۸، اکتوبر ۱۹۹۴ء،)

مرحوم حکیم منظور (سرینگر)

چالیس برس سے حسن ساہو اُردو ادب کی خدمت کرتے آئے ہیں شان سے لکھتے ہیں اور چھپتے ہیں۔ حسن ساہو کے فن کے بارے میں مختصراً یہ کہوں گا کہ اِس طویل عرصہ میں اُن کا اپنی زمین سے رشتہ روز بہ روز گہرا ہوتا جارہا ہے۔ اُن کی (Commitment) اپنی سرزمین اور لوگوں سے بڑھتی گئی ہے۔ اسلوب اور ٹرنڈ کے اعتبار سے اُن کے افسانے مکمل ہیں۔ اُن کے فن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے افسانوں میں جو کلیدی کردار ہوتا ہے وہ کتنا ہی افسردہ وغم زدہ کیوں نہ ہو اس کے باوجود وہ پڑھنے والے کو زندگی کے مثبت پہلوؤں اور پُر کیف لمحات کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ حسن ساہو کے جتنے بھی افسانے ہیں وہ کسی نہ کسی انسانی اِقدار کے گرد گھومتے ہیں۔

(رسم رونمائی ''اندھا کنواں'' ۱۲، ستمبر ۱۹۹۶ء ہفت روزہ ''جبروت'')



غلام نبی خیال (سرینگر)

حسن ساہو نصف صدی سے لکھتے آئے ہیں وہ ایک کہنہ مشق قلم کار ہیں اور انسانی قدروں کو اُجاگر کرنے میں ہی یقین رکھتے ہیں۔ اُردو زبان پر اُنہیں خاصہ عبور ہے He is a quite and composed writer

(ہفتہ روزہ "وائس آف امریکہ" مورخہ ۲۳/۱۹ نومبر ۲۰۰۳ء)



وجیهه احمد اندرابی (سرینگر)

حسن ساہو صحافت اور ادب دونوں میدانوں کے شہسوار ہیں۔ اس پُر آشوب دور میں جبکہ حسن ساہو نے صحافت کا پیشہ اپنایا ہے اور اس پیشے میں زیادہ تر وقت درکار ہے اِن حالات میں کہانیاں لِکھنا کارے دارد والا معاملہ ہے اُنہوں نے اس کارنامے کو بخوبی انجام دیا ہے

(ہفت روزہ "جبروت" ۱۲، ستمبر ۱۹۹۶ء)



مرحوم عمر مجید (سرینگر)

حسن ساہو ریاست جموں وکشمیر کے ایک منفرد اور منجھے ہوئے افسانہ نگار اور ادیب ہیں۔ اُن کے افسانوی مجموعہ 'اندھا کنواں'' کو شایان شان پزیرائی ملی ہے۔ حسن ساہو اپنے افسانے اور اُن کے کردار سماج سے اخذ کرتے ہیں۔ لہٰذا اُن کے افسانے براہِ راست زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کا عقیدہ انسانی زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور غموں سے تعلق رکھتا ہے اور ادب میں صرف ''اچھے ادب'' میں یقین رکھتے ہیں۔ اچھا ادب جو زندگی کا ضامن ہے۔

(روزنامہ ''آفتاب'' سرینگر ۵، مئی ۲۰۰۷ء)



آنجہانی موھن یاور (جموں)

حسن ساہو ایک سچا سچا فنکار ہے۔ اُس کی تحریر میں
شوخی بھی ہے اور رنگینی بھی، جدت بھی ہے اور ندرت
بھی۔ اُس کے افسانوں میں محبت کے سوتے پھوٹتے
ہیں۔ اور قوس قزحی عشق جھلکتا ہے۔ وہ بہت کم لکھتا ہے
مگر خوب لکھتا ہے اُس کو افسانے کے فن پر مکمل عبور
حاصل ہے اُسے پلاٹ کی تلاش میں سرگرداں نہیں رہنا
پڑتا ہے بلکہ اُن کے گرد و نواح میں پلاٹ تتلیوں کی طرح
منڈلاتے رہتے ہیں۔ وہ جب چاہے اُنہیں اپنی تحریر میں
قید کر لیتے ہیں۔

(تبصرہ ''پھول کا ماتم'' افسانوی مجموعہ)



پروفیسر مجاھد اللہ خان (بھوپال)

حسن ساہو ایک ایسا فن کار ہے جس نے حقیقت کو افسانوں کا موضوع قرار دیا۔ اور فن کو سچ بولنا سکھایا۔ جس ماحول میں پرورش پائی، مشاہدہ کیا، تجربہ کیا اور ٹٹولا اُس کو قلم بند کیا۔ پرستانوں کے خیالی قصوں سے دور اِس دنیا کے واقعات پیش کئے جس میں وہ رہے۔ غریب کسانوں، غم زدہ مزدوروں، بے بس لاوارث بچوں اور مظلوم عورتوں کی درد کی داستان اُن کے افسانوں کا حصہ ہے۔

(مکتوب بنام زاہدہ تقدیس فردوسی)

جبل پورہ، ۲، ستمبر ۲۰۰۷ء

☆☆☆

ورِیند پٹواری (دہلی)

آپ کی کچھ کہانیاں پڑھ چکا ہوں جنہوں نے فنی اعتبار سے متاثر کیا ہے۔

(مکتوب ۲۱، اگست ۲۰۰۲ء)

☆☆☆

عبدالغنی شیخ (لیہہ لداخ)

''اندھا کنواں'' کی چند کہانیاں پڑھیں۔ اچھی کہانیاں ہیں۔ پلاٹ، ٹکنیک، زبان اور اسلوب کے اعتبار سے کہانیاں اچھی لگیں۔

(مکتوب ۲۵، فروری ۲۰۰۲ء)



دیپک بر کی (سرینگر)

آپ کی کہانیوں میں ترقی پسندی کی آہٹ سُنائی دیتی ہے۔ افسانوں کی زبان سلیس اور رواں ہے اور ایسا نہیں لگتا کہ اپنائی گئی زبان میں کہیں (Jerks) لگتے ہوں۔ پلاٹ اور منظر کشی بھی خوب کی گئی ہے کرداروں کا چناؤ اور اُن کا (Portrayal) فنی خوبیوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔۔۔ آپ اپنی تحریروں کے ذریعہ بنی نوع اِنسان کو سُدھارنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔۔۔ آپ بجائے مبلغ کے صرف ادیب رہنے کی کوشش کرتے تو سونے پر سہاگہ کا اثر ہوتا۔

(مکتوب ۳، ستمبر ۲۰۰۱ء)



ڈاکٹر رینو بہل (چندی گڑھ)

حسن ساہو اُردو ادب کا نمایاں و معتبر نام ہے۔ اُن کے افسانوں کے کردار متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنی مجبوریاں ، ذمہ داریاں، خوشیاں، غم، رنجشیں، خواہشیں اور مختلف رنگوں کے جذبات سے سج کر قاری کے دل میں اُتر جاتے ہیں۔ زبان و بیان سلیس اور دلکش ہے۔ پلاٹ عام زندگی اور اُس کے اِرد گرد گھومتے ہیں۔ اور معاشرے کے نظام کو قاری کے روبرو کرتے ہیں۔ غرض حسن ساہو کو دل چسپ اور دلکش افسانہ لکھنے کا ہُنر بخوبی آتا ہے۔ اُن کی فنکارانہ صلاحیتوں اور اسلوبیاتی خصوصیتوں کی میں قدر کرتی ہوں۔

(مکتوب ۵، ستمبر ۲۰۰۵ء)



ڈاکٹر آدیے سرن ارمان (مرادآباد)

حسن ساؔہو شہرت کے پیچھے کبھی نہیں بھاگے، وہ مقصدیت کے قائل ہیں اور اسی کے پیش نظر افسانوی ادب کی تخلیق میں سرگرم عمل رہے۔ وہ معصوم بچے کی طرح سچ بولنے والے فنکار ہیں ۔۔۔۔ اُن کے افسانے روزمرہ کی چلتی پھرتی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں۔ اُنہوں نے دورانِ ملازمت استحصال، بے انصافی، بے مروتی، رشوت ستانی، حق تلفی، افسراں کی بے جا منمانی اور مظالم سے مجروح سماجی بدحالی قریب سے دیکھی ہے۔ اُنہیں اِنسانی نفسیات پر عبور حاصل ہے۔ جب وہ کسی منظر یا واقعہ کی تصویر کشی کرتے ہیں تو قاری اپنے وجود میں کردار کا درد محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہی سچے اور اچھے فنکار کی پہچان ہے۔ میرے خیال سے ساؔہو بہترین افسانہ نگار ہے۔

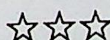
(مکتوب ۱۷۔اکتوبر ۲۰۰۳ء)



مرحوم صوفی محی الدین (سرینگر)

حسن ساہو اُردو افسانہ نویسوں میں دوسرے دور سے تعلق رکھتے ہیں اُن کے لکھنے کا زمانہ کافی طویل ہے۔ افسانوں کے تھیم اور اُن کے موضوع کئی دہائیوں کے واقعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ افسانہ ''اندھا کنواں'' میں ملک کے تقسیم کے دور میں پیش آمدہ واقعات کی حسین پیرایہ میں عکاسی کی ہے۔ دوسرے افسانوں میں سماجی مسائل کو بہت خوبصورتی سے اُبھارا گیا ہے۔ ساہو صاحب کے افسانے پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک بیدار ذہن انسان ہیں وہ بدصورتی میں خوبصورتی تلاش کرتے ہیں۔

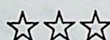
(اداریہ روزنامہ ''سرینگر ٹائمز'' ۲۵، جولائی ۱۹۹۹ء)



مرحوم پروانہ ردولوی (دہلی)

مختصر طور حسن ساہو کے افسانوں کے تعلق سے میری یہ رائے ہے کہ وہ اپنے اِرد گرد کے واقعات اور حالات کو کہانیوں کا رُوپ دیتے ہیں۔ وادیٔ کشمیر میں اُردو کے بہت سے شاعر و ادیب ہو چکے ہیں اور آج بھی ہیں۔ مگر افسانوی ادب میں حسن ساہو کا پلڑا بھاری ہے۔

(مکتوب یکم اکتوبر ۲۰۰۲ء)



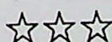
ڈاکٹر محمود شیخ (جبل پور)

حسن ساہو کے سبھی کردار انسانی زندگی کا ایک فطری حصہ ہیں۔ اُن کے رنج وغم اور محرومیاں طویل اور خوشی و انبساط کے لمحے مختصر ہیں۔ اُن کا مُشاہدہ بہت گہرا ہے جذبات نگاری کے بیان میں وہ کم سے کم الفاظ میں اپنی بات کہنے کا ہُنر جانتے ہیں۔ حسن ساہو کا بیانیہ نہایت سادہ اور انداز بیاں روایتی طرز کا عکاس ہے۔ وہ معاشرتی ناہمواریوں کے درمیان زندگی کا حُسن تلاش کرتے ہیں۔

حسن ساہو اجتماعی زندگی کے قائل ہیں۔ اُن کے بیشتر کردار نہایت جذباتی ہیں۔ ہمت اور حوصلہ کے فقدان کے باوجود زندہ رہنے کی خواہش اُن کے دلوں میں روشن ہے۔ کچھ افسانے عورت اور مرد کے جذباتی رشتوں کی تجدید میں لکھے گئے ہیں جو خوبصورت ہیں اور جن میں زندگی تیز تر ہے۔

(تبصرہ ماہنامہ ''پیش رفت'' دہلی، جون ۱۹۹۷ء)

(ہفت روزہ ''صداقت'' پونہ، ۱۵، جون ۱۹۹۷ء)



وسیم مینائی (دہلی)

حسن ساہو کسی سیاسی نقطہ نظر کا پیروکار نہیں ہے وہ صرف رواداری اور مساوات میں یقین رکھتا ہے۔ اور احساس برتری کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا ہے۔۔۔ کچھ اہل ادب تفریحی ادب کو زندگی کا حاصل تصور کرتے ہیں اور کچھ دانشور سماجی مسائل پر لکھنے کو اصل ادب بتاتے ہیں۔ حسن ساہو نے اپنی کہانیوں میں تفریح ادب کو بھی موقع دیا ہے اور زندگی کے مسائل سے متعلق بھی غور وخوض کرنے کی دعوت دی ہے۔ کہانیوں کے اجزائے ترکیبی اُن کی کہانیوں میں ایک معیار بن کر اُبھرتے ہیں ۔غرض حسن ساہو کے افسانے قاری کے ذہن کو تفریح بھی مہیا کرتے ہیں اور دعوتِ فکر بھی دیتے ہیں۔

(تبصرہ ماہنامہ ''پیش رفت'' مارچ ۱۹۹۸ء)



ڈاکٹر سہیل انجم (دہلی)

حسن ساہو کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اُنہیں اورُوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ حساس دل مِلا ہوا ہے۔ کیونکہ اُن کے افسانوں میں دردوکرب کی پرچھائیاں بھی ہیں، غم ویاس کی لکیریں بھی، دل شکستگی وافسردگی کی داستانیں بھی اور زمانے کی بے وفائیوں کا ماتم بھی ہے۔

حسن ساہو کے افسانوں کے موضوعات نہ دیومالائی ہیں نہ داستانوی، نہ خیالی ہیں نہ ماورائی بلکہ اُن کے افسانوں کے کردار اِس سماج میں چلتے پھرتے اور اِسی ماحول کے پروردہ ہیں جس ماحول میں ہم زندگی گزار رہے ہیں۔ غرض اُن کے افسانوں کے کردار آج کے جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے انسان ہیں۔ حسن ساہو افسانہ لکھنے سے قبل سماج میں کردار تلاش کرتے ہیں۔ جب کوئی واقعہ اُن کے دل کے تار کو چھیڑتا ہے تو اُن کا قلم صفحہ قرطاس پر دوڑنے لگتا ہے۔

(تبصرہ اُردو بک ریویو، مارچ/اپریل ۲۰۰۰ء)



مرحوم سید محمد جابر جوراسی (لکھنو)

حسن ساہو وادئ کشمیر کے سنجیدہ اور بالغ النظر صحافی ہیں۔ وہ خاموش ادیب، سماجی کارکن اور اچھے مقرر ہیں۔ وہ ایک باصلاحیت اور ممتاز افسانہ نگار بھی ہیں۔ اُردو والوں کو اُن کی افسانہ نگاری پر فخر کرنا چاہیئے۔ عرصہ سے بیشتر افسانے سطحی جذبات کی عکاسی کیا کرتے ہیں۔ اور معاشرے کی اخلاقی قدروں کو تباہیوں کے گہرے غار میں ڈھکیلتے رہتے ہیں لیکن حسن ساہو کے افسانے مختلف و مختصر ہیں جن کو پڑھنے کے لئے قاری کو وقت کی گنجائش نکالنے کی زحمت نہیں کرنا پڑتی۔ ہر افسانہ معاشرے یا ماحول میں موجود کسی کجی یا قباحت پر مدبرانہ طنز ہے۔ اُن کے افسانے و مضامین زندہ حقیقتوں کی جانب مُصلحانہ اِشارے کرنے والے ہیں۔

(ماہنامہ ''اصلاح''، لکھنو، اپریل ۱۹۹۸ء)



مدیر ماھنامہ کتاب نما

حسن ساہو کا شمار ہمارے عہد کے اُن افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جو کسی ''ازم'' تحریک یا رجحان سے متاثر ہوئے بغیر اپنا تخلیقی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔
حسن ساہو کے افسانوں کا وصف موضوع کا انتخاب ہے وہ اپنے آس پاس کے ماحول سے اپنے افسانوں کا مواد لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے اکثر افسانوں میں انسانی زندگی کی رمق ملتی ہے۔

(ماہنامہ کتاب نما، جنوری ۲۰۰۱ء)



مرحوم ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی (امروہہ)

حسن ساہو کہنہ مشق ادیب اور صحافی ہیں۔ اُن کے افسانوں میں کشمیری ماحول، کشمیری مقامات، کشمیری تہذیب، کشمیری ثقافت، وہاں کے پیڑوں اور پھلوں کے نام اور وہاں کے افراد ہر جگہ غالب نظر آتے ہیں: علاقائی تہذیب کی بھی ادب میں ایک خاص اہمیت ہے۔ اُن کے افسانوں کے کردار خیر وشر دونوں کا نمونہ ہیں۔ اِخلاقی سبق اور آفاقی قدریں حسن ساہو کے افسانوں میں ملتی ہیں۔ رات و دن سماج میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں اُن کو مصنف نے اپنی کہانیوں کا ہدف بنایا ہے۔ اُن کے قدم ہر جگہ زمین پر ٹکے رہتے ہیں اُن کے افسانوں کے پلاٹ میں کہیں جُھول نہیں، مکالمے بڑے جاندار ہیں۔ زبان پختہ ہے اور استعارے بڑے دل کش ہیں۔

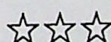
(تبصرہ ہفت روزہ ''ہماری زبان'' دہلی ۲۱/۱۵ نومبر ۲۰۰۰ء)



"راشٹریہ سہارا" دہلی (سرینگر)

مصنف حسن ساہو کے افسانوں میں زندگی کی تلخی بھی ہے اور شیرینی بھی، عشق کا سوز بھی اور حُسن کا ساز بھی ہے۔ جہاں تک زبان و بیان کا سوال ہے تو مصنف نے سیدھی سادی زبان کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں افسانوں میں شاعرانہ اندازِ بیان بھی اختیار کیا ہے۔ غرض حسن ساہو کے افسانوں کے پلاٹ اور کردار اُردو کلچر کے دایرے میں ہی گھومتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے افسانوں میں تفریح کے ساتھ ساتھ اصلاح معاشرہ پر بھی توجہ مرکوز کی ہے۔ اس لئے اُن کے افسانے اعلیٰ اِنسانی اسلامی اور ہندوستانی اِقدار کے حامل ہے۔

(تاریخ ۲۸ مئی تا ۲ جون ۱۹۹۷ء)



شجاع کشمیری جرنسلٹ (سرینگر)

حسن ساہو ایک صحافی، افسانہ نگار، شاعر اور بے باک قلم کار ہیں۔ انہوں نے ادب کے ساتھ ساتھ سماجی و سیاسی میدان میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ کئی افسانوی مجموعوں کے علاوہ مذہبی اور سماجی معاملات پر بھی لاتعداد مضامین تحریر کئے۔ زندگی کے مختلف شعبوں پر لکھنے کا تجربہ رکھتے ہیں ۔ مجموعی طور ساہو صاحب ایک معیاری ادیب، افسانہ نگار، اور صحافی ہیں جو دُکھی اِنسانیت کے کام آنا عبادت سمجھتے ہیں اُن کی تحریروں میں حقیقت کی عکاسی ہوتی ہے۔

اکثر کہانیاں پڑھ کر یہ اصلیت سامنے آجاتی ہے کہ حسن ساہو نے معاشرے و سماج کا غم اپنے سینے میں سمیٹ لیا ہے۔ زمانے کے حوادث سے مُتاثر ہونے کے باوجود اُن کی قلمی کاوشوں میں ضعف نہیں آیا۔

(مکتوب ۲۲، جون ۲۰۰۸ء)

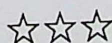


پروفیسر همراہ کاشمیری (سرینگر)

حسن ساہو کہانیاں لکھنے میں بہت مہارت رکھتے ہیں۔حسن ساہو کی افسانوی زبان بہت آسان ہے۔اتنی آسان کہ ایک بچہ بھی اُن کی کہانیوں کا مطالعہ کرسکتا ہے ۔آسان آسان الفاظ میں زندگی کے تجربات پیش کرنا اُن کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ پلاٹ اور کردار میں فنی صلاحیت ڈال کر حسن ساہو روایتیں پار کر کے آگے ہی اگے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ اُن کا نام سارے ہندوستان میں احترام سے لیا جانے لگا ہے۔اُن کی ہر کہانی حقیقت کی ترجمانی کرتی ہے۔

حسن ساہو کے افسانوی کرداروں میں زندگی جھانکتی ہے اور ہر کردار کسی نہ کسی موڑ پر گہرے نقوش چھوڑ دیتا ہے۔

(تبصرہ روزنامہ ''روئیداد جہاں'' سرینگر ۲۱، جنوری ۱۹۹۷ء)



زاھدہ تقدیس فردوسی (جبل پورہ)

حسن ساہو کے افسانوں اور کہانیوں میں ہندوستان کی مٹی کی مہک سی ہوتی ہے۔ اُن کے افسانوں میں خاص طور پر کشمیری عوام کی موجودہ سُلگتے مسائل کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کچھ افسانے کشمیری عوام پر کئے جا رہے ظلم وستم، اُن کی زبانوں پر پڑے ہوئے تالے اور زخمی روح کی تڑپ کی حقیقی عکاسی کر رہے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کی پُرفریب چالوں، مکار سیاست دانوں کی عیاریوں اور بے رحم حکومت کے جبر وظلم کی داستانیں اُن کی کہانیوں کے خاص موضوع ہیں۔ اُن کے افسانوں کے کردار دراصل ہماری آپ کی دنیا کے جانے پہچانے انسان ہیں جنکی زندگی ایک مجبور و بے بس انسان کی دبی دبی سسکیوں اور زخمی لبوں پر ادھوری آہ کی شکل میں اُبھر کر سامنے آتی ہے۔

(تبصرہ۔ ماہنامہ ''گلابی کرن'' دہلی، اپریل ۲۰۰۲ء)



اوم پرکاش بجاج (جبل پور)

عام روش سے ہٹ کر آپ افسانے تحریر کرنے لگے ہیں یہ خوش آیند بات ٹھہری۔ ''نمک حلال'' ایک اچھوتے موضوع کو افسانچہ کی شکل دینا اور اتنی کامیابی کے ساتھ نبھائے جانا کوئی آسان بات نہیں۔ آپ کی سوچ میں بلا کی پختگی سمانے لگی ہے۔

(مکتوب ۳۰ اپریل ۱۹۹۸ء)



مولانا غلام حسین باقری (ناگپور)

''اندھا کنواں'' دیکھنے پر مجھے کشف ہوا کہ حسن ساہو منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ قلم کار میں بلا کی تیز رفتاری موجود ہے۔۔۔ حقیقی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو اِس انداز سے تحریر میں لایا گیا ہے کہ جیسے قاری جائے واردات پر موجود ہو۔ متعلقات وجزوئیات کو سلیقہ سے زینتِ قرطاس کیا گیا ہے۔

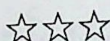
(مکتوب ۱۶، اکتوبر ۲۰۰۳ء)



ڈاکٹر نذیر مشتاق (سرینگر)

حسن ساہو ایک کہنہ مشق ادیب اور صحافی ہیں۔ اُن کے افسانے و مضامین برسوں قبل سے زیر مطالعہ رہے۔ اور آج تک بھی شوق سے پڑھتا ہوں۔

(مکتوب ۱۹، نومبر ۱۹۹۷ء)



بے تاب جے پوری (جموں)

شاید میں آپ کے لئے اجنبی ہوں۔ لیکن آپ میرے لئے اجنبی نہیں۔ آپ کے افسانے اور مضامین میں شوق سے طالب علمی کے زمانے سے پڑھتا آیا ہوں۔

آپ کو معاشرے و سماج میں پھیلی قباحت کو اُجاگر کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔

(مکتوب ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۸ء)



ڈاکٹر قاضی اشرف سرینگر

''اندھا کنواں'' کے سب افسانے ایک دم حقیقت لگتے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے آدمی کو محسوس ہوتا ہے کہ واقعی سب افسانے ''پیش لفظ'' پر برابر اُترتے ہیں۔ زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہے اور اس بابت خوش ہوں کہ حسن ساہو ایک عام قاری کے لئے لکھتے ہیں۔ ساہو صاحب کے لئے چند اشعار کشمیری میں ؎

ژِ چھکھ اَکھ داستان سربستہٕ اَکھ راز
کتابا اَکھ وُلتھ اِنسانہٕ سُند مأز

دِلیلا زیٹھ چھُنہٕ یتھ آنتھ یا اَنڈ
چھِ یتھ منز ساسہٕ بُدی اَفسانہ سربَنڈ

قوی اُلعزم ژِ اَکھ دیو قامت
دُعا بوزِن خوداتھاوِنے سلامَت

ژِ ساہو داستان سربستہٕ اَکھ راز
چھِ یتھ رازس اَنڈ رُگل وحدِتکی ساز

(مکتوب ۲۰ فروری  ۱۹۹۸ء)

☆☆☆

سلیم انصاری (جبل پور)

آپ کے ادبی اور صحافتی صلاحیتوں کا معترف ہوں۔ ''اندھا کنواں'' اورہفت روزہ ''دوران'' کا مطالعہ کر کے یقین ہو چلا ہے کہ آپ کے ذہن کی تمام کھڑکیاں سمندرِ ادب وصحافت کی طرف کُھلتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ حقیقت نگاری کا فن آپ کے دورانِ خون میں شامل ہے۔

(مکتوب ۲۸ جولائی ۱۹۹۸ء)



عبدالرشید شاہ (چیف ایڈیٹر ہفت روزہ ''ندائے مشرق'' سرینگر)

حسن ساہو کشمیر کے ایک ممتاز اور صاحبِ طرزفکر ادیب ہیں۔ اُس کی تازہ تصنیف ''اندھا کنواں'' چند خوبصورت اور تحریک پسند افسانوں کا مجموعہ ہے۔

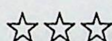
(اداریہ ''ندائے مشرق'' ۵ ستمبر ۱۹۹۶ء)



خنداں لکھنوی (سرینگر)

حسن ساحؔو کا افسانوی مجموعہ ''پھول کا ماتم'' میرے پیش نظر ہے۔ میں نے بعض افسانے پڑھے جو یقیناً صف اول کے افسانوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں۔ اُن میں مقصدیت بھی ہے اور سسپنس بھی، ماحول کی ترجمانی بھی اور ماحول کی بعض کیفیات پر ناقدانہ اشارے بھی ملتے ہیں۔ حسن ساحؔو زبان وبیان پر قدرت رکھتے ہیں اور جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں خوش اسلوبی سے کہہ جاتے ہیں۔

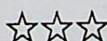
(ہفتروزہ ''مدینۃ العلم''، لکھنو، ۵، اپریل ۱۹۸۵ء)



ایڈیٹر ھفت روزہ ''سیاست'' (جموں)

حسن ساحؔو کو نہ صرف اُردو زبان پر پورا پورا عبور حاصل ہے بلکہ اُنہیں فن افسانہ نگاری میں بھی یدطولیٰ حاصل ہے۔ حسن ساحو نے جس خوبصورتی سے اپنے خیالات وجذبات کو الفاظ میں جامہ پہنایا ہے وہ اُن ہی کا حصہ ہے سلیس اور بامحاورہ زبان کا استعمال خوبصورتی سے کیا ہے۔

(۱۱مارچ ۱۹۸۲ء)



سید سجاد حسین رضوی (سرینگر)

حسن ساہو ایک معتبر کہانی کار کے علاوہ بہترین مضمون نویس بھی ہیں۔ سیاسی، سماجی اور اور دینی طرز کے مضامین ضبط تحریر میں لانے میں حسن ساہو کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ اُن کے افسانے ہمارے سماج اور معاشرے میں موجود اچھائیوں اور برائیوں کی خوبی کیساتھ ترجمانی کرتے رہتے ہیں۔ زبان سلیس اور عام فہم کہ معمولی سے معمولی پڑھا لکھا قاری بھی متاثر ہو۔ ''گردش دوران'' یقیناً ادبی و علمی حلقوں میں سراہا جائے گا۔

(مکتوب ۱۷ جولائی ۲۰۰۸ء)

رام پرکاش کپور (ہریانہ)

آپ کے حقیقت پر مبنی کچھ افسانے راہنمائے تعلیم میں پڑھ چکا ہوں۔ بہت پسند آئے۔ آپ کا افسانہ ''ایک پہلو یہ بھی ہے'' دوبارہ پڑھ کر بھی دل کو چھو گیا اور آپ کا حقیقت پسندانہ انداز بہت ہی خوب ہے۔

(مکتوب ۲۹ مئی ۲۰۰۵ء)

☆☆☆

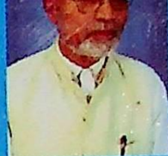
انجنئیر ارشد حسین خان (سرینگر)

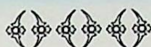
حسن ساہو کے کچھ مضامین اور افسانے جریدوں و اخباروں میں پڑھنے کا موقع ملا۔ حسن ساہو ایک ممتاز صحافی، تجزیہ نگار اور افسانہ نویس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فعال سماجی کارکن بھی ہے۔

(مکتوب ۱۳ جولائی ۲۰۰۸ء)

☆☆☆

GARDISH-E-DORAN





ادب کی مثال ایک سمندر کی سی ہے جس میں ہر سمے چھوٹی بڑی لہریں اُبھرتی رہتی ہیں۔ بعض لہریں سطح پر نمایاں ہوتی ہیں اور بعض پانی کی گہرائیوں میں ----- ہاں سمندر کی گہرائیوں میں اُبھرنے والی لہریں دکھائی نہیں دیتی ہیں لیکن [illegible] بار سمندر کی گہرائیوں کو چیرتی ہوئی یہ لہریں اُوپر اُٹھ کر ایک طوفان کی سی صورت [illegible] لیتی ہیں، میرے خیال میں حسن ساہو کی کہانیاں اِن ہی لہروں کی مانند ہیں [illegible] سمندر کی خاموشیوں کو چیرتی ہوئی ایک ہلچل بپا کرتی ہیں۔ ذہنی ہلچل، سوچنے اور [illegible] ہلچل، کچھ کہنے اور کچھ سُننے کی ہلچل --- حسن ساہو کی شخصیت میں جو خلوص، سا[illegible] اور نفاست ہے اُن کی تحریروں میں اُس کی بھرپور جھلک ملتی ہے وہ درد و کرب ملتا ہے۔ جو ہماری آج کی زندگی کا ایک حصہ بن چکا ہے اس وجہ سے اُن کی کہانیاں زندگی سے زیادہ قریب نظر آتی ہیں اور اُن کے کردار آس پاس گھومتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ معاشرتی زندگی کی عکاسی بڑی خوبی سے کرتے ہیں، اُن کی کہانیوں میں مقامی رنگ ہے، انسانی نفسیات کی باریکیاں ہیں، واقعات اور حادثات کا دلچسپ پھیلاؤ ہے کہانی پیش کرنے کا اُن کا اپنا ایک انداز ہے --- اور سب سے بڑی بات یہ کہ حسن ساہو کی کہانیاں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اُنہیں آنے والے کل پر پورا پورا بھروسہ ہے --- !!!

نور شاہ

Meezan Publishers

Opp. Fire & Emergency Services H.Q., Batamaloo, Srinagar, Kashmir-190009

Phone : 2470851 Fax 0194-2457215 Cell : 9419002212, 9906677468

E-mail : meezanpublishers@rediffmail.comr